بنگال میں اُردو ناول

پروفیسر یوسف تقی

© بحق مصنف محفوظ

بنگال میں اُردو ناول (تحقیق وتنقید)

مصنف : پروفیسر یوسف تقی
اشاعت : ۲۰۰۷
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۲۰۰ روپئے
ناشر : یوسف تقی
پتا : ۱۹-بی، مارکوئیس لین، کولکاتا-۷۰۰۰۱۶
طباعت : دی گلوزی آرٹ پریس
۲ - ۱۶ بیچ، ۱۷/کینل ویسٹ روڈ، کولکاتا - ۱۲
کمپوزر : سعیدہ رحمان، شگفتہ یاسمین

دستیاب

عثمانیہ بک ڈپو: ۱۰۴/لورچیت پور روڈ، کولکاتا-۷۰۰۰۷۳

یا

ناشر

Bengal Main Urdu Novel

Author
Prof. Yousuf Taqi
19 - B, Marquis Lane, Kolkata - 700 016
Phone No. : 2252-7590
Price : Rs. 200/-
Edition : 2007

مغربی بنگال کے اردو بولنے والے معصوم

عوام

کے نام

جو شاطر اور خود غرض رہنماؤں

کے

ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں

عــرض حــال

بنگال کے اردو ادب کا منظر نامہ کچھ اتنا دھندلا ہے کہ تمام اصناف کے صحیح تعین اور واضح خدوخال کی تلاش ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اور اسکے ارتقائی سفر کا ایمانداری اور سنجیدگی سے جائزہ لینا کچھ کم دشوار گزار نہیں۔ اسکی شکستہ کڑیوں کو جوڑنا جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اسکی سیر حاصل تاریخی اور ارتقائی دستاویز مرتب نہ ہوسکی۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی وجوہات ہیں جو یہاں کے اردو ادب کو اردو دنیا سے متعارف کرانے میں مانع واقع ہوئیں۔ جن میں ایک وجہ یہ ہے کہ بنگال کے بیشتر اردو ادیب، شاعر، محقق اور نقاد اس احساس کمتری کے شکار رہے ہیں کہ ان کا تعلق ایسے علاقے سے ہے جو لسانی اعتبار سے غیر اہم اور اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ وہ اکثر اس بات کے متلاشی رہے کہ اردو کے اہم مراکز کے اہل نظر ان کی تخلیقات پر ایک گرم نگاہ ڈال دیں تو ان کی ''ادبی عاقبت'' سنور جائے۔ جبکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں ایسے ادیب و شاعر بھی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ''اہل زبان'' سے لوہا لیا ہے بلکہ ان سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی جرأت کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نام عبدالغفور نساخ کا لیا جاسکتا ہے۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو مراکز کے مقابلے میں یہاں خاطر خواہ ادب پیدا نہ ہوسکا۔

بہرکیف، زیر نظر کتاب ''بنگال میں اردو ناول'' اسی جذبے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے کہ اس صنف کے ادبی سفر کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔

راقم الحروف کا ایک مقالہ ''احسن : بنگال کا ایک اہم ناول'' کے عنوان سے سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مقالہ کی پزیرائی نے مجھے حوصلہ بخشا اور میں نے مغربی بنگال میں لکھے گئے اور شائع شدہ ناولوں کے تفصیلی مطالعے کا ارادہ کیا جو آج آپ کے سامنے ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں جو دشواری پیش آئی وہ مواد (ناول) کی فراہمی کی تھی۔ مغربی بنگال کی اہم لائبریریوں کو کھنگالنے کے بعد کل گیارہ ناول ہی ہاتھ لگے۔ اسی دوران عزیزی اشرف احمد جعفری نے یہ اطلاع دی کہ ان کے پاس کچھ ناول ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے وعدہ بھی کیا کہ وہ مجھے پہنچا دیں گے۔ لیکن ہفتوں انتظار کرنے کے بعد جب وہ نہیں آئے تو ایک صبح عزیزی شاہد ساز اور امتیاز احمد کے ہمراہ میں ان کا اسکول پہنچ گیا۔ (ان کا علمی ذخیرہ ان دنوں اسکول ہی میں رہتا تھا) وہاں مجھے تقریباً ۱۴ ناول ملے، جنھیں میں اپنے ساتھ لے آیا، اور جو مہینوں میرے کام کی تکمیل تک میرے پاس رہے۔ عزیزی اشرف احمد جعفری کی اس عنایت کا میں شکر گزار ہوں اور ان کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں اس کام کا اجر دے۔ اس طرح اس کتاب میں کل ۲۶ ناولوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ مختلف تذکرہ نما مضامین میں ذیل کے ناولوں کی خبر ملتی ہے، لیکن کسی لائبریری سے یہ دستیاب نہیں ہوسکے۔

(۱) گمنام ہمسفر — صغریٰ سبزواری
(۲) ترچھی نظر — شیخ اللہ بخش بخشی

(۳) بڑی آپا	شائق احمد عثمانی
(۴) دوست کی بیوی	شائق احمد عثمانی
(۵) موہنی	شائق احمد عثمانی
(۶) معرکۂ شام	رفیق احمد زاہدی
(۷) بڑی دیدی	مائل ملیح آبادی
(۸) ادھوری بات	مائل ملیح آبادی

بہرکیف، دو درجن سے زائد ناولوں کا تجزیہ حاضر خدمت ہے۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ پوری دیانتداری سے ان ناولوں کا جائزہ اپنی بساط بھر لیا جائے اور یہ کوشش کی ہے کہ قارئین اس کتاب کے حوالے سے ان ناولوں تک پہنچ سکیں۔ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوں، اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آخر میں عزیزی ڈاکٹر سنجر ہلال بھارتی کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کا پروف پڑھا۔ ساتھ ہی ساتھ ان تمام حضرات کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح میرے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کی۔

یوسف نقی

بنگال میں اُردو ناول

اُردو ناول کے ابتدائی نقوش ۱۹ رویں صدی کی آخری دہائیوں میں نذیر احمد، شرر اور رسوا کی تخلیقات کی صورت میں سامنے آئے اور اُردو کے نثری خزانے کو مالا مال کرنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ اس دور میں قاری اور فنکار دونوں کی دلچسپی ناول سے بڑھی اور ناول نگاروں نے مقتضائے وقت کے پیشِ نظر اس صنف کے فنی اور فکری تقاضوں کو سنجیدگی سے برتنے کا ثبوت دیا۔ اس دور کے فوراً بعد یعنی ۲۰ رویں صدی کے ابتدائی برسوں میں جہاں پریم چند کا پہلا ناول 'اسرارِ معابد' بنارس کے ہفتہ وار اخبار 'آوازِ خلق' میں قسط وار شائع ہونے کے بعد کتابی شکل میں ۱۹۰۵ء میں سامنے آیا، وہیں ان کا دوسرا ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' ۱۹۰۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں بنگال سے بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کا ناول 'احسن' شائع ہوا۔ یہ ناول بھی اخبار 'شحنۂ ہند' (میرٹھ) میں ۲۴ راکتوبر ۱۹۰۷ء سے قسط وار شائع ہونا شروع ہوا اور حصۂ اوّل کی آخری قسط ۱۶ رجون ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ 'احسن' ناول کا حصۂ اوّل ۱۹۸ رصفحات پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں ہے، جبکہ حصۂ دوم کا ٹائپ میں ہے، جو ۱۲۸ رصفحات پر محیط ہے۔

بنگال میں اُردو ناول نگاری کے سلسلے میں جو اطلاعات بنگال میں لکھے گئے تذکروں یا تذکرہ نما تصانیف اور مضامین میں ملتی ہیں، وہ کچھ یوں ہیں:

> ''افسانہ نگاری کے پہلو بہ پہلو یہاں کے ادیبوں نے ناول نگاری کی طرف خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔ خواجہ عتیق اللہ شیدا کا ناول 'عبرت' اور خواجہ محمد اشرف کا ناول 'خوبیٔ قسمت' بہت مشہور ہے۔ شیدا (متوفی ۲۹-۱۹۲۸ء) نے کئی کامیاب جاسوسی ناول بھی لکھے جن میں سے 'دیوی چودھرائن' اور 'خدا کی شان' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بدرالزماں بدرؔ ایک اچھے ناول نگار تھے اور ان کا ناول 'احسن' بہت مشہور ہے۔''
>
> (بنگال میں اُردو نثر کا ارتقا، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، ص:۳۶)

> ''اردو کے ابتدائی ناولوں میں پربھات چندر مکھرجی کا ناول 'بیولا' بنگلہ کی 'منگل کتھا' کی طرز پر لکھا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں نواب سیّد محمدؔ آزاد کا طنزیہ و مزاحیہ ناول 'سوانح عمری مولانا آزاد' شائع ہونا شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ستیش چندر بوس کے کئی ناول شائع ہوئے۔ 'جمیلہ' (۱۹۰۷ء)، 'سلیمہ بیگم' (۱۹۱۴ء)، 'خیال گلشن' یعنی 'فسانہ پدماوتی' (۱۹۱۵ء)، کالی کرشنا مکھرجی کا ناول 'ولائتی'

شائع ہوا۔''

(بنگال میں اُردو نثر، پروفیسر وحید اختر، ص:۶۰)

''نواب صاحب کی مشہور تصنیف 'نوابی دربار' ہے۔ یہ ناول سے زیادہ ڈراما ہے۔ اس میں ڈرامائی انداز کی وجہ سے بلا کا زور پیدا ہو گیا ہے اور قصہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ ہے۔''

(۱۹ویں صدی میں بنگال میں اُردو، جاوید نہال، پہلا ایڈیشن)

''خجستہ (اختر) کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں 'کوکب دری' اور 'آئینۂ عبرت' خاص طور پر قابل ذکر ہیں''۔

(بنگال میں اُردو، وفا راشدی، ص:۲۰۴)

''بدرالزماں بدرؔ کلکتوی بیک وقت خوش فکر شاعر بھی تھے اور بہت اچھے ناول نویس بھی۔ ان کا ایک ناول 'احسن' مقبول عام و خاص ہے اور بنگال کے ہر کتب خانہ میں محفوظ ہے۔''

(بنگال میں اُردو، وفا راشدی، ص:۱۴۰)

''نوابی دربار' (۱۹۷۸ء) رام بابو سکسینہ اسے ناول قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر مشتاق احمد (مرحوم) کی رائے میں یہ ایک ڈراما ہے۔ درحقیقت اُردو نثر میں یہ ایک طنزیہ تخلیق ہے۔ اس کتاب میں ظریفانہ پیرائے میں پرانے فاقہ مست نوابوں کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ اس میں رئیسوں کے مشاغل، مصاحبین کے ہتھکنڈے، معاشرے کی تباہ کن رسمیں اور بہت سی رائج الوقت خرابیوں پر طنز ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اسکے ابتدائی حصے 'اودھ پنچ' میں بھی شائع ہوتے رہے۔ پہلی بار یہ کتاب لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ ۱۹۷۵ء میں اس کا ایک ایڈیشن پروفیسر مشتاق احمد کی تدوین کے ساتھ کلکتہ سے شائع ہوا۔''

(بنگال میں اُردو نثر کی تاریخ، سالک لکھنوی، ص:۱۵۶)

''انہوں نے (بدرالزماں نے) ایک ناول 'احسن' بھی لکھی جو شائع نہ ہو سکی۔''

(بنگال میں اُردو نثر کی تاریخ، سالک لکھنوی، ص:۱۷۲)

''تین ناولیں ان (خواجہ عتیق اللہ شیدا) سے یادگار ہیں۔ ۱۔ 'فسانۂ عبرت'، ۲۔ 'دیبی چودھرائن' جو شائد اسی نام کی ایک بنگالی ناول کا ترجمہ ہو سکتی ہے اور ۳۔ 'خدا کی شان' بقول سیّد اقبال عظیم 'یہ تینوں ناول میری نظر سے گزرے ہیں' یہ تینوں ناولیں اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔''

(بنگال میں اُردو نثر کی تاریخ، سالک لکھنوی، ص:۱۷۰)

محولہ بالا اقتباسات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے' وہ یہ ہے کہ:

۱ - بنگال میں اب تک کے ادبی تاریخ لکھنے والوں میں سنجیدگی نہیں ہے۔

۲- خواجہ عتیق اللہ شیدا کے تین ناول ہیں: (الف) 'عبرت' یا 'آئینہ عبرت'، (ب) 'دیبی چودھرائن' اور (ج) 'خدا کی شان'۔ لیکن ان ناولوں کے سنین اشاعت معلوم نہیں۔

۳- اُردو کے ابتدائی ناولوں میں پربھات چندر مکھر جی کا ناول 'بیولا'، سیّد محمد آزاد کا 'سوانح عمری مولانا آزاد' ہیں۔

۴- پروفیسر وحید اختر نے ۲۰ویں صدی کے آغاز میں ستیش چندر بوس کے ناول 'جمیلہ' (۱۹۰۷ء) اور 'سلیمہ بیگم' (۱۹۱۴ء) کا ذکر کیا ہے۔ یہ ناول بنگالی ہندو کے ضرور ہیں لیکن نہ تو یہ بنگال میں لکھے گئے اور نہ ہی بنگال سے شائع ہوئے۔ بابو ستیش چندر بوس کا قیام آگرہ میں تھا اور وہیں کے مطبع اندو پرکاش سے یہ ناول شائع ہوئے۔

۵- سیّد محمد آزاد کا 'نوابی دربار' ڈراما ہے، یا ناول؟

۶- بدرالزماں بدرؔ کا ایک ناول 'احسن' ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا' جبکہ سالک لکھنوی اپنی تازہ ترین کتاب 'بنگال میں اُردو نثر کی تاریخ' میں غیر مطبوعہ ہونے کی خبر دیتے

ہیں۔

۷- خجستہ اختر کے دو ناول 'کوکب دری' اور 'آئینۂ عبرت' شائع ہو چکے ہیں لیکن تاریخ اشاعت معلوم نہیں۔

مذکورہ نکات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بنگال میں اُردو ناول نگاری کی ابتدا اُردو کے دوسرے مراکز کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور بیسویں صدی کے ابتدائی دو دہے اس صنف کے لئے فعال رہے۔ پہلی دہائی کے جس ناول کے سلسلے میں معلومات فراہم ہوئی ہیں، وہ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کا ناول ''احسن'' ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ 'احسن' (حصہ اول) ۲۴/اکتوبر ۱۹۰۷ء سے قسط وار 'شحنۂ ہند' میں شائع ہونا شروع ہوا اور ۱۶/جنوری ۱۹۰۸ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا، اس لئے بدرؔ نے ہر قسط کا ایک عنوان دے دیا تھا۔ اس طرح ناول کے پہلے حصّے کے ۳۷/ابواب ہیں۔ بعض باب تو بہت ہی مختصر، صرف دو صفحات پر مشتمل ہیں۔ ویسے ۱۹۲۸ء میں بدرؔ کلکتوی کے صاحب زادے اسدالزماں نے رسالہ 'جدید اُردو' میں اس ناول کو دوبارہ شائع کروانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس طرح مئی ۱۹۳۸ء سے جنوری ۱۹۳۹ء تک یہ ناول قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس دوران ناول کے نو ابواب شائع ہوئے۔ پہلی قسط کی اشاعت اسدالزماں کے ذیل کے نوٹ کے ساتھ ہوئی:

> ''سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد اگر کوئی فلم کمپنی یا کوئی دارالاشاعت اس کی کاپی رائٹ خریدنا چاہیں تو مجھ سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ اس کی کاپی رائٹ محفوظ ہے، اس لئے اس کا اقتباس قانوناً جرم سمجھا جائے گا۔
> والد صاحب کی آخری وصیت یہ تھی کہ ناول 'احسن' جلد دوم میں ضرور شائع کر دوں۔ سر دست ان کی وصیت کی تکمیل میرے لئے مشکل امر ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ میری زندگی میں ناول 'احسن' جلد اوّل و دوم علم دوست احباب کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ اس وقت یہ تجویز مجھے بہت پسند ہے کہ 'جدید اُردو' میں 'احسن' کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ علم دوست احباب سے استدعا ہے کہ 'جدید اُردو' کا ہر نمبر خاص طور سے خرید لیا کریں کیوں کہ اس کا سلسلہ اس جریدہ میں تا اختتام قائم رکھا جائے گا۔''

ناول کے شروع میں ایک صفحہ کا دیباچہ ہے جس میں ناول نگار نے ناول لکھنے کی وجہ دوستوں کا اصرار بتائی ہے اور پھر ناول کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

> ''ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بھی قصّے یا داستان ہی کے ہیں لیکن مغربی اصلاح میں وہ منظر جس میں قدرت کی عجوبہ نیرنگیوں کا ایک ہنگامۂ عبرت آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے، جو اخلاقی نتائج پیدا کرتا اور دلوں کو وجد میں لاتا ہے کہ دیو اور بھوت اور چڑیلوں اور پچھلیایتوں کے بے سر و پا اور بے نتیجہ قصّے جو بے فکروں اور آرام طلبوں کو مرض النوم میں مبتلا کرتے اور ان کے کان تھپک کر مردوں سے شرط بدوا کر خواب آسائش میں سلا دیتے ہیں۔ ناول تو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے والے اور عبرت کا صور کانوں میں پھونکنے والے ہیں۔ زندہ دلوں کے کارنامے جو تاریخ کے قالب میں ڈھالے گئے ہیں، وہ نقوش میں اُمنگ پیدا کرنے اور مہذب بنانے میں سب کے سب ناول ہیں، جن کو اکثر ڈرامٹسٹ اسٹیج تک پہنچاتے ہیں۔ یہ دنیا کی جنگ میں وہی کام دیتے ہیں جو رجز میدانِ جنگ میں۔''
>
> (دیباچہ، ناول 'احسن'، ص:۱)

مذکورہ اقتباس سے ناول نگار کی اس فن سے آگاہی اور ان کے مطمحِ نظر کا پتا چلتا ہے کہ ناول کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا قصہ 'نیند کی گولی' نہ ہو بلکہ کانوں میں 'عبرت کا صور' پھونکنے کا کام انجام دے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول صرف دلچسپی کا سامان ہی فراہم نہ کرے بلکہ اس سے اخلاقی، سماجی اور معاشی تہذیبی اصلاح کا کام بھی لیا جائے۔

آیئے! اب یہ دیکھیں کہ بدرؔ کلکتوی کے عہد یعنی ۲۰/ویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ناول کی تعریف کن لفظوں میں کی گئی ہے۔ شررؔ لکھنوی ۱۹۱۷ء کے 'دلگداز' میں رقم طراز ہیں:

> ''ناول کا آغاز خیال اور طبع زاد قصّوں سے ہوا ہے جو ابتدا محض داستان گوئی کی شان سے قلم بند کئے گئے۔ اس کے بعد یہ ترقی کہ محض خیال آفرینی چھوڑ کے تاریخی واقعات میں رنگ آمیزی کر کے دلچسپ داستانوں کی شان پیدا کی گئی۔ اس کے بعد ناول

کی ترقی کا تیسرا درجہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کے واقعات نئے نئے اُسلوب سے دکھائے جائیں اور ان کے ذریعہ سے معاشرت واصلاحِ زندگی کا سبق دیا جائے۔''

('دلگداز'، ص: ۲۴۸۔۲۴۶)

انہی دنوں پریم چند نے 'زمانہ' کے ۱۹۰۵ء کے شمارے میں لکھا کہ:

''.....ناول کا میدان افراط سے بہت وسیع ہوگیا ہے، کہیں تو اس میں زندگی کے کسی اہم مسئلے پر بحث کی جاتی ہے.....کہیں اس میں انسانی فطرت کی تشریح کی جاتی ہے.....دل کے جذبات میں اُمیدوں اور مایوسیوں کے نقشے اُتارے جاتے ہیں، کہیں اخلاقی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ناول نگار کبھی دوست کا کام کرتا ہے اور کبھی ناصح کا، کبھی فلسفی بنتا ہے، کبھی طب کا ماہر.....''

(قلم کا سپاہی، ص: ۸۲، امرت رائے، ترجمہ: حکم چند نیّر)

بدؔر کے ناول 'احسن' کے دیباچے کے اقتباس اور مذکورہ دونوں اقتباسات سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ناول کے فن کا بنیادی عنصر قصہ ہونے کے باوجود داستانی قصوں سے علاقہ نہیں رکھتا۔انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی اس طرح کی جائے کہ انسان صرف اس سے حظ اُٹھانے کا کام نہ لے بلکہ اپنی اخلاقی اور سماجی اصلاح کی طرف بھی توجہ دے۔گویا ناول نگار اپنے قاری کو انبساط پہنچانے کے ساتھ ساتھ معلمِ اخلاق کا کام بھی انجام دے۔

۱۹ویں صدی کے اختتام تک اُردو میں دو اہم ناول منظرِ عام پر آ چکے تھے۔'فردوس بریں' (۱۸۹۹ء) اور 'امراؤ جان ادا' (۱۸۹۹ء)۔گرچہ ان دونوں ناولوں کے موضوعات اور انداز ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ایک کا موضوع اگر تاریخ کے ان اوراق پارینہ کو اُلٹنا ہے، جن میں مذہب کے نام پر اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، تو دوسرے کا موضوع ایک حادثاتی المیہ ہے جو ایک صنفِ نازک کی زندگی کو بدل کر دنیا کی ننگی حقیقتوں سے دوچار ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔لیکن اس اختلاف کے باوجود جو چیز دونوں میں مشترک ہے، وہ ہے 'اصلاحی جذبہ' جو اس عہد کا بنیادی رویہ تھا۔اگر 'فردوس بریں' میں شرؔر نے در پردہ مذہب کے ان ٹھیکیداروں سے اجتناب برتنے کی عوام کو تلقین کی ہے جو اس کی آڑ میں فرقہ بندی کے نظریہ کو فروغ دے کر اسلام کی جڑیں کمزور کرنے پر مامور تھے، تو دوسری طرف 'امراؤ جان ادا' میں رسؔوا نے ہماری سماجی زندگی کی بے راہ روی کو رنگینیوں اور لطافتوں کے ساتھ اُجاگر کر کے خود احتسابی کی دعوت دی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دونوں ناول نگاروں میں ایک بات کی یکسانیت اور بھی ملتی ہے، وہ یہ کہ دونوں رومانیت (Romanticism) کی تحریک سے متاثر تھے اور دونوں اپنے اپنے دائرے میں رہ کر ایک مخصوص رومانی فضا پیدا کرتے ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ کہ اس وقت تک ناول کے عناصرِ ترکیبی تقریباً معین ہو چکے تھے۔بقولِ یوسف سرمست:

''ناول کے مختلف عناصرِ ترکیبی یعنی پلاٹ، کہانی، کردار نگاری، پس منظر اور نظریۂ حیات میں ایک آہنگ اور توازن ملتا ہے۔''

(بیسویں صدی میں اُردو ناول، ص: ۵۷)

ظاہر ہے، یہ آہنگ اور توازن کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ناول نگار کے پیشِ نظر اس کے عناصرِ ترکیبی ضرور رہے ہیں اور وہ کما حقہ ناول کے فن سے واقف ہیں۔یہی وجہ کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جو بھی ناول لکھے گئے، ان کے مطالعے سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تقریباً ہر ناول نگار نے اپنے ناول کو فنی خوبیوں سے آراستہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، خواہ وہ منشی سجاد حسین انجم ('نشتر' ۱۹۰۵ء) ہوں یا پریم چند ('ہم خرما وہم ثواب' ۱۹۰۶)، 'اسرارِ معابد' (۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء) یا بدرالزماں بدؔر کلکتوی ('احسن' ۱۹۰۷ء)، مرزا سعید 'خوابِ ہستی' (۱۹۰۵ء) اور 'یاسمین' (۱۹۰۸ء)۔ناول 'احسن' میں بدرالزماں بدؔر کلکتوی نے عناصرِ ترکیبی کو اپنے ناول میں بحسن وخوبی برتا ہے، جو ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

احسن

ناول کا پلاٹ بہت ہی پیچیدہ ہے اور ناول نگار نے اسے کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ قاری کا ذہن الجھتا چلا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے اختتام تک کہانی میں تجسس برقرار رہتا ہے۔

ناول کی ابتدا میں ایک مختصر مگر حیرت افزا کہانی ''تمہید'' کے عنوان سے ہے۔یہ تمہیدی کہانی اسد اور دلؔربا کے دلدوز واقعہ پر مبنی ہے، جس میں دونوں یکے

بعد دیگرے موت سے ہمکنار ہوتے ہیں اور یادگار کے طور پر ایک بچی چھوڑ جاتے ہیں، جس کو ایک اجنبی عورت ان کے مرنے کے بعد کمرے میں آتی ہے اور بچی کو لے کر فرار ہو جاتی ہے۔ ساتھ میں بکس میں رکھے ہوئے کسی خط کو بھی لے جاتی ہے۔ یہ واقعہ علی گڑھ کے کسی علاقے میں رونما ہوتا ہے۔

اس کے بعد اصل ناول شروع ہوتا ہے، جس کی کہانی کلکتہ، ہگلی، مدنی پور وغیرہ کے رئیسوں، جاگیرداروں، متوسط اور نچلے طبقے کے رہنے والوں کے گرد گھومتی ہے۔

ہگلی میں فیروز بیگ اپنی اہلیہ اخترؔی بیگم اور بیٹی رابعہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ جب کہ ان کے حقیقی بھائی دلاور بیگ' اپنی اہلیہ مشتری بیگم اور بیٹا ابوالفضل کے ساتھ مدنی پور میں قیام پذیر ہیں۔ دونوں بھائی خاندانی رئیس ہیں لیکن ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ فیروز بیگ جتنے ہی نیک اور شریف ہیں، دلاور بیگ اتنے ہی بدقماش اور عیاش۔ ابوالفضل کی پیدائش سے قبل تک ان کی زندگی شراب و شباب میں غرق تھی۔ انہوں نے اٹاوہ کی رہنے والی جمیلہ (خورشیدی) کو رکھیل بنا کر رکھ چھوڑا تھا لیکن ابوالفضل کی پیدائش کے بعد اسے کچھ دے دلا کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن خورشیدی کچھ لئے بغیر، انتقام کی آگ اپنے سینے میں دبائے وہاں سے چلی جاتی ہے اور اپنے عاشق ظہیر، جو اٹاوہ میں اس کا ملازم ہوا کرتا تھا، اور اب کلکتہ کے اقبال پور کے علاقے میں اس کی ایک خانقاہ ہے اور جو پیر شاہ ظہیر کے نام سے مشہور ہے، سے مدد لیتی ہے بلکہ ان دونوں کا ناجائز رشتہ بھی ہے جس کے نتیجے میں ایک لڑکا حسیر خان کے نام سے جنم لیتا ہے لیکن خورشیدی، ظہیر شاہ پر اس راز کو افشا نہیں کرتی ہے۔ خورشیدی کا قیام کلکتہ میں کسبیوں کے علاقہ میں ہے اور وہ وقتاً فوقتاً ظہیر شاہ سے ملنے اقبال پور اس کی خانقاہ میں چوری چھپے آتی ہے۔ گرچہ حسیر خان کا قیام ظہیر شاہ کی خانقاہ ہی میں ہے۔ لیکن ظہیر شاہ کو اس وقت تک معلوم نہیں ہوتا ہے جب تک اس کا قتل خود اس کے ہاتھوں نہیں ہو جاتا ہے۔

مدنی پور کا لالچی رئیس دلاور بیگ اپنے بیٹے ابوالفضل کی شادی اپنے بھائی فیروز بیگ کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے کرنا چاہتا تھا اور فیروز بیگ نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اس طرح وہ بھائی کی جائیداد پر بھی قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لئے بار بار بھائی سے تقاضا بھی کرتا تھا لیکن فیروز بیگ کی بیگم اختری کسی طرح راضی نہیں ہوتی تھی اور یہ معاملہ ٹلتا چلا جاتا تھا۔ فیروز بیگ نے بھائی کی یقین دہانی کے لئے ایک دستاویز تیار کی تھی کہ ان کی بیٹی رابعہ کی شادی ابوالفضل سے نہ ہونے کی صورت میں وہ دلاور بیگ کے قرض دار تصور کیے جائیں گے۔ قرض کی رقم ۵/لاکھ روپئے ہوگی۔ وہ یہ دستاویز خود مدنی پور جا کر اپنے بھائی کو دینے کے لئے ہگلی اسٹیشن آتے ہیں۔ لیکن بھیڑ میں وہ ریل پر سوار ہونے کی بجائے اسٹیشن پر گر کر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور جب ہوش میں آتے ہیں اس وقت تک گاڑی نکل جاتی ہے۔ واپس گھر آتے ہیں کہ راستے میں چند ڈاکو ان پر حملہ کرتے ہیں اور قریب تھا کہ ان کا کام تمام کر دیتے، جھاڑی سے احسن نمودار ہوتا ہے اور ان کی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

احسنؔ کلکتہ کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو رابعہ کو کلکتہ کے ایک مکان کی کھڑکی میں دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ ہگلی سے کلکتہ اپنے ماموں مرزا حسن عسکری کے یہاں کسی تقریب میں آتی ہے، احسن نوکرانی کی مدد سے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ رابعہ کون ہے اور اس کا اصلی گھر کہاں ہے۔ اس غرض سے وہ ہگلی جاتا ہے جہاں اتفاقاً رابعہ کے والد کی جان بچانے کا اسے موقع مل جاتا ہے۔ مرزا حسن عسکری لکھنؤ کے ذی حیثیت، شریف النفس شخص ہیں۔ ان کی شادی شمس النساء سے ہوتی ہے۔ انہوں نے ہفتہ دس دن قبل کلکتہ کے مشہور محلّہ امام باغ میں ایک دو منزلہ مکان خریدا تھا، جہاں ان کی والدہ کے سوگ میں فقیروں، مسکینوں اور ناداروں کو خیرات تقسیم کی جاتی ہے۔ اسی تقریب میں شرکت کی غرض سے رابعہ ہگلی آتی ہے جہاں اس کی آنکھیں احسن سے دوچار ہو جاتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

شمس النساء بظاہر اٹاوہ کے شوکت جاہ اور رضیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ شوکت جاہ ہگلی میں مستقل قیام پذیر ہیں اور وہاں ان کی دو کوٹھیاں، قمری سرائے اور شمسی سرائے کے نام سے لب دریا ہیں۔ لیکن دراصل رضیہ کا ناجائز تعلق دلاور بیگ سے رہتا ہے جس کی نشانی شمس النساء ہے۔ رضیہ بیگم بہت بدکار لیکن نہایت چالاک عورت ہے۔ وہ برسوں اپنے شوہر شوکت جاہ کو بیوقوف بناتی رہتی ہے۔ شوکت جاہ اس پر مکمل اعتماد کئے ہوئے ہیں اور آخر میں جب اس کی بے وفائی کا راز افشا ہوتا ہے تو وہ دونوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں اور وہ کامیاب ہوتے ہیں' لیکن اس کے لیے شوکت جاہ کو روپوش ہونا پڑتا ہے اور بھوت کا ہوّا کھڑا کیا جاتا ہے۔

شمس النساء کی خصلت بھی اپنی ماں کی طرح ہے۔ وہ بھی مرزا حسن عسکری سے بے وفائی کرتی ہے اور ابوالفضل، جو دلاور بیگ کا بیٹا ہے، سے ناجائز تعلق رکھتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک بیٹا ہوتا ہے، جسے ایک غریب عورت گل شبو پالتی ہے اور جو وقفے وقفے سے شمس النساء سے اچھی خاصی رقم، راز کو پوشیدہ رکھنے اور

بچے (امجد) کو پالنے کے عوض لیتی ہے۔

انیس جو احسن کا جگری دوست ہے' اس کی تلاش میں ہگلی جاتا ہے اور سازشوں کا شکار ہو کر احسن کے دھوکے میں ظہیر شاہ کی ''بیت السیاست'' میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں رابعہ کو بھی اغوا کر کے وہاں لایا جاتا ہے۔ پھر وہ دونوں بڑی چالاکی سے بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں نے ظہیر شاہ کو حسیر خان کا قتل کرتے دیکھا تھا، اس لیے وہ دونوں پولیس اسٹیشن پہنچ کر ظہیر شاہ کے سارے راز فاش کر دیتے ہیں۔ ظہیر شاہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ غرض اس طرح وہ تمام افراد جو کسی نہ کسی طرح برائی پر مائل تھے، کیفر کردار کو پہنچتے ہیں۔ رضیہ اور شمسہ ماری جاتی ہیں۔ دلاور بیگ، خورشیدی، ظہیر شاہ اور ابوالفضل جیل کی ہوا کھاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ جو صالح تھے اور ایمانداری اور سچائی کی طرف راغب تھے، آخر میں اپنے اپنے چاہنے والوں سے مل جاتے ہیں۔ جیسے احسن اور رابعہ، انیس اور حسینہ۔

اس ناول میں کرداروں (ضمنی اور اہم) کی تعداد تقریباً ۲ درجن سے زیادہ ہے۔ ناول نگار نے بنگال میں رہنے والے مقامی اور غیر مقامی مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی زندگی کو کہانی کا موضوع بنایا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بنگال (خصوصاً کلکتہ) کے وہ اردو داں طبقے جو نوابین کے عہد کی یادگار تھے، کی علمی، اقتصادی خوش حالی و بدحالی اور اخلاقی و نجی زندگی اچھائیوں اور کج رویوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ ان میں شرفاء کے علاوہ عام آدمی بھی ہیں۔ متوسط طبقے کے پڑھے لکھے بھی اور جاہل بھی۔ پیر و مرشد بھی اور مریدین بھی۔ ایسے نچلے طبقے کے لوگ بھی شامل ہیں جن کے اندر علم و اخلاق کی بو باس تو دور، ان کی زبان بھی درست نہیں اور ایک مخصوص قسم کی اردو (جسے ''کلکتیا اردو'' کہتے ہیں) بولتے ہیں، اور جن کی دنیا زیادہ تر جرائم کی دنیا ہے۔ غرض انہوں نے تقریباً ہر طبقے کی نمائندگی اپنے کرداروں کے ذریعہ کروائی ہے۔ ویسے ان کرداروں کی بھیڑ میں گرچہ ہر کردار کا اپنا اپنا مقام ہے اور تقریباً تمام کرداروں نے اپنے عمل سے خود کا ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ نمونتاً صرف چار کرداروں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

احسن

احسن کہانی کا ہیرو ہے اور اس کی ''پہلی نظر کا عشق'' کے سہارے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ احسن میں خود ناول نگار یوں رقم طراز ہیں:

> ''دارالامارت کلکتہ کے ایک سربرآوردہ خاندان کا یہ نوجوان مفخر یادگار ہے۔ اس کے آباواجداد علمی قابلیت اور مالی حالت کے لحاظ سے مہتم بالشان رہ چکے ہیں۔ یہ نوجوان ہنوز شیر خوار تھا کہ شفیق والد نے قضائے مبرم کے ہاتھوں اجل کو لبیک کہا۔ جائیداد پر مرحوم کی زوجۂ محترم کے سوا کسی کا حق نہ تھا۔ جس نے اپنے نورِ نظر کی پرورش کے ہر ضروری سامان کے بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور بفضل ایزد تعالیٰ وہی بچہ آج کلکتہ کا ایک نامور گریجویٹ کی حیثیت سے آپ کے پاس انٹرویوس ہو رہا ہے۔ والد ماجد اس وقت تک بقید حیات اور اسی طرح اس لختِ جگر پر جان سے نثار ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی احسن نے اپنے کو خودمختار پایا مگر سعید اور نیک خو ہونے کی وجہ اس کے آباواجداد کی فراہم کی ہوئی دولت کو وہ حسرت ناک انجام دیکھنا نصیب نہ ہوا جو کلکتہ کے اکثر متمولوں کی دولت کا ان کی رحلت کے بعد مقسوم ہوتا ہے''۔

اس لئے وہ آج بھی ایک عالی شان مکان میں رہتا ہے اور اس کا زیادہ تر وقت مطالعۂ کتب میں گزرتا ہے۔ وہ انگریزی زبان اور اس کے ادب سے صرف آشنا ہی نہیں بلکہ اس زبان میں اچھی استعداد بھی رکھتا ہے اور انگلستان کی یونیورسٹی کے کسی علمی مقابلے حصّہ لینے کے لیے دلجمعی سے جٹا ہوا ہے۔ اسے مشرقی ادبیات کا بھی شغف ہے، اردو اور فارسی وغیرہ پر اسے اچھی خاصی دستگاہ حاصل ہے۔

کہانی کی ابتدا میں رابعہ کی پہلی نظر کے عشق میں گرفتار ہو کر وہ ایک عاشق زار کی طرح نظر آتا ہے۔ ایک ایسا کردار جو اپنے دوست انیس سے التجا کرتا ہے کہ کسی طرح بھی اس کے وصال کی تدبیر کرے اور بات بات پر اسے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کردار کی یہ مجہولیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہتی اور جب وہ رابعہ کا پتہ لگانے ہگلی جاتا ہے اور راستے میں ایک ضعیف العمر شخص پر چار ڈاکوؤں کو حملہ کرتے دیکھتا ہے تو مسیحا بن کر اس کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اور ضعیف العمر شخص (مرزا فیروز بیگ) کی جان بچا کر ان کے گھر تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں اس کا کردار بڑا متحرک نظر آتا ہے اور اس کے بعد اس کا کردار بتدریج ارتقا پذیر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح رابعہ کے مکان میں سازش کے تحت جو آگ لگتی ہے اور جس میں رابعہ کو جلانے کی کوشش کی جاتی ہے' احسن بہت ہی جاں بازی سے اسے بچاتا

ہے۔غرض احسن کا کردار کہانی کے ارتقا اور دلچسپی کے لیے ایک اہم کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔

رابعہ :

رابعہ، مرزا فیروز بیگ اور اختری بیگم کی بیٹی ہے جو ہگلی کے زمین دار اور رئیس ہیں۔ وہ کہانی کی ہیروئن ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پری جمال ہونا ضروری ہے۔اس لیے ناول نگار نے اس کے حسن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''اس کے لمبے لمبے سیاہ گھونگھر والے بال، اسکی بڑی بڑی آنکھیں، خم دار ابرو، دراز پلکیں، موتیوں جیسے دانت، اس کے خداداد حسن ظاہر کررہے ہیں۔ ناظرین! فیروز منزل کی رابعہ ہی غیرت حور ہے یہی زہرہ شمائل جس کے حسن کا دیوانہ احسن، حسن عالم افروز کے علاوہ رابعہ اور بھی بہت سے اوصاف سے متصف ہے۔ درسی کتب کے علاوہ بہت سی مسئلہ مسائل کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرلیا ہے اور نہایت نیک سیرت اور سلیقہ شعار ہے۔ ہم جولیوں سے کبھی شکر رنجی نہ ہوتی۔ خندہ پیشانی کے ساتھ سب سے ملنا، صاف اور سادے لفظوں میں جواب دینا گویا اس کی فطرت ثانی ہے۔ والدین و بزرگوں کی اطاعت وفرماں برداری اس کے خصائل جبلی ہیں جس نے ایک دفعہ اس سے باتیں کیں، خصائل پسندیدہ اور عادات حمیدہ کا دل سے قائل ہوگیا۔''

مذکورہ صفات کے علاوہ اس میں مزید کچھ اوصاف حمیدہ ہیں کہ وہ قاری کو متاثر کرنے میں بہت کامیاب ہے۔ وہ طبیعتاً وفا شعار اور اردے کی پکی ہے۔ سخت سے سخت اور نامساعد حالات میں بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں ہوتی ہے، جس کا ثبوت کہانی میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ البتہ ناول نگار نے اس کے کردار کو زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ گرچہ کہانی اسی کے عشق اور اس کے عاشق کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔

شمس النساء بیگم :

شمس النساء کا کردار کہانی میں ایک جاندار اور متحرک کردار ہے۔ پہلے اس کردار کے متعلق ناول نگار کیا فرماتے ہیں، دیکھ لیا جائے:

''اس دور بین بیگم (شمس النساء) کے والدین (مرزا شوکت جاہ اور رضیہ بیگم) ہگلی کے متمول اور جلیل القدر رؤسا میں سے تھے۔ مادری نسب کی شاخیں اعلیٰ اور معزز خاندان سے ملی ہوئی ہیں۔ فیروز منزل سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ان کی عالیشان عمارت موسوم بہ ''قمری سرائے'' واقع تھی۔ اس کے والدین کی شادی ان کے عین شباب کے عالم میں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ہی اس کے مادری اور پدری خاندان کے لوگ یکے بعد دیگرے قضا کر گئے۔ موسمی وبا نے والدین کے سر سے چند ہی دنوں میں ان کے بزرگوں کا سایہ اٹھا کر ڈیڑھ لاکھ کی سالانہ آمدنی کی جائیداد پر قابض ودخیل کردیا۔ دولت سے یہ بالکل مطمئن تھے اور مرزا شوکت جاہ اور رضیہ بیگم دل کھول کر صرف بھی کرتے تھے۔

شمس النساء کی عمر کے چوتھے سال مولانا دبیر صاحب اس کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے۔ یہ ازلی ذہین لڑکی اپنی خداداد ذہانت کی تائید سے لکھنے پڑھنے میں روز افزوں ترقی کرتی گئی اور عرصۂ قلیل میں متعدد کتب درسیہ سے فراغت پا کر علوم دینیہ کی تحصیل میں مصروف ہوگئی۔ سارے جاننے والے ان کی قدرتی ذہانت اور فطری متانت کے قائل ہوگئے۔ (اور) جس کی نشوونما اور علمی ترقی دیکھ کر اس کے والدین خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا..... یہ حوروش نہایت آسائش اور آرام سے شفیق والدین کے سایۂ عاطفت اور قابل اتالیق (مولانا دبیر) کے زیر نگرانی حد شباب تک پہنچی۔''

یہ تو ناول نگار کے بیانات تھے اب دوسرے کردار شمس النساء بیگم کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، ملاحظہ کیجئے :

''تنگ دل..... بدمزاج..... بات بات پر جھگڑنا، جھنجھلانا اور ذرا سی بات میں بگڑ جانا، غصہ دکھانا، برا بھلا کہنا گویا شمس النساء کی گھٹی میں پڑا ہے۔''

انیس اس سے اس وقت اس طرح مخاطب ہوتا ہے، جب شمس النساء انیس کی جان بچانے کے بعد اس سے اپنی شہوانی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتی ہے:

''بدذات، بدکردار، بے حیا عورت! ارے کم بخت، تجھے شرم نہیں آتی کہ اپنی عصمت کے ساتھ دیدہ ودانستہ نیک بخت، مرزا حسن عسکری (شوہر) کی آبرو پر بھی پانی پھیرنے کے لئے کمر بستہ ہے۔''

مذکورہ اقتباسات سے شمس النساء کا جو کردار ابھرتا ہے، قابلِ نفرین ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز بھی ہے۔ شمس النساء بظاہر ایک بڑے باپ (شوکت جاہ) کی بدکردار لڑکی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ لیکن وہ ایک ناجائز اولاد ہے اور اس کا حقیقی باپ دلاور بیگ ہے۔ شوکت جاہ نے اسے دنیاوی اور دینی دونوں تعلیمات سے آراستہ کروایا لیکن اس کے خون کی خرابی نے اس سے وہ سب کچھ کروائے جو کسی طرح بھی نہیں کرنا چاہئے۔ شوہر سے بیوفائی، ابوالفضل جو اس کا (ظاہری رشتے میں) بھتیجا تھا اور (حقیقی رشتے میں سگا بھائی) سے جنسی اختلاط اور دو بچوں کو جنم دینا، پھر انیس سے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے اسے زیر کرنے کی کوشش کرنا اور ناکام ہونے کی صورت میں اس پر قاتلانہ حملہ کرنا وغیرہ گویا ایسے افعال ہیں جو ناقابل معافی ہیں۔ اور جن کی سزا اسے دردناک صورت میں یعنی خون تھوکتے ہوئے موت کی شکل میں ملتی ہے۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول میں شمس النساء کا کردار جتنا متحرک ہے، کوئی دوسرا کردار نہیں۔ وہ حالات کے پیش نظر اپنی گفتگو، اپنا عمل تبدیل کر سکتی ہے۔ اپنی عیاشی کے لئے شوہر کو بڑی چالاکی سے شہر سے باہر بھیج دیتی ہے۔ اور مولانا دبیر جو اس کے اتالیق ہیں، انہیں پوری طرح اپنی مٹھی میں رکھتی ہے، اور یہ سب کچھ کہانی میں تجسس اور دلچسپی برقرار رکھنے میں معاون بنتے ہیں۔

شوکت جاہ :

شوکت جاہ کا کردار ایک ایسے دولت مند شخص کا ہے، جو ایک شریفانہ زندگی اپنے چاہنے اور چاہی جانے والی بیوی رضیہ کے ساتھ گزارتا ہے اور اپنی بیوی کی دلجوئی کے لیے اس کی ہر خواہش کی تکمیل کو اپنے اوپر فرض کر لیتا ہے۔ اس وقت اس کے کردار میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیوی سے، جسے وہ محبت کا پتلا سمجھتا ہے اور جس کی محبت اس کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتی ہے، وہ بے وفا اور مکار ہے۔ اور وہ بیٹی (شمس النساء) جس پر وہ جان چھڑکتا ہے، اس کی نہیں ہے، کسی اور کی ہے ایسے عالم میں عموماً لوگ ذہنی توازن کھو دیتے ہیں اور اس سے وہ سب کچھ سرزد ہو جاتا ہے، جب باعثِ ہلاکت اور تباہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں شوکت جاہ کا کردار بڑا اہم ہو جاتا ہے، جب وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے حالات کی سنگینی کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی عصمت باختہ بیوی اور اس کے عاشق یا محبوب کا کام تمام کرنے کے لئے منصوبے بناتا ہے۔ اسے تو اب تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ اس کی بیوی کا عاشق یا محبوب کون ہے؟ اس سربستہ راز کو جاننے کے لیے وہ اپنے وفادار ملازم قاسم کی مدد لیتا ہے۔ اب شوکت جاہ کی زندگی کے صرف دو مقاصد تھے۔ ایک تو اپنی بیوی اور اس کے عاشق سے انتقام لینا اور دوسرا، اپنے چھوٹے بھائی اسد کی گمشدہ بیٹی سے ملنا۔ بالآخر جب یہ دونوں مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے تو بڑی بہادری سے یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کی جائیداد کا ۲/۳ حصہ اس کی گمشدہ بھتیجی کو دیا جائے اور بقیہ اس کا وفادار غلام قاسم کی تحویل میں جائے۔ اور وہ خودکشی کر کے خود کو ختم کر دے۔ شوکت جاہ اس ناول کا وہ اہم کردار ہے، جو ناول کے آخر تک تجسس کا باعث ہوتا ہے۔ خود کو محل کے ایک گوشے میں روپوش رکھنے اور رات گئے سیاہ لباس میں منارۂ خموشاں پر نمودار ہونے کی وجہ سے قاری کے جذبۂ تحیر کو مہمیز کرتا ہے۔ وہ اپنی رئیسانہ شان وشوکت ہر عالم میں سنجیدگی سے نباہتا ہے۔ وہ ایک گداز دل رکھنے کے باوجود ایک طاقتور ذہن کا مالک بھی ہے۔ وہ معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور اس سے نبرد آزما ہونے کی سکت بھی۔

اس کے کردار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی مقام پر اپنی سماجی اور اخلاقی سطح سے نیچے نہیں گرتا اور اپنے مقابل سے مراتب کا خیال رکھ کر گفتگو کرتا ہے۔ مذکورہ کرداروں کے مطالعے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کردار نگاری کے فن سے کما حقہ واقف ہیں۔ ان کے کردار ناول نگار کے اشارے پر عمل پیرا نہیں ہوتے بلکہ حالات اور ماحول کے زیرِ اثر حرکت میں آتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو مقتضائے وقت ہوتا ہے۔ بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کے ناول ''احسن'' کے کردار، اردو کے ابتدائی ناول نگاروں کے کردار کی طرح یک رخا نہیں ہیں۔ اگر کوئی شیطان ہے تو شروع سے آخر تک شیطان ہی ہے، اور اگر فرشتہ ہے تو مرتے دم تک فرشتہ۔ بلکہ ان کے کردار جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں۔ ان میں تبدیلی بھی رونما ہوتی ہے اور وہ حالات کے تحت اور موقع محل کے موافق خود کو تبدیل کرنا بھی جانتے ہیں۔ بدر نے کئی کردار ایسے تخلیق کئے ہیں جو اپنے اندر دوئی رکھتے ہیں۔ مثلاً ابوالفضل ایک جگہ ابوالفضل ہے تو دوسری جگہ سعید کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ جمیلہ، خورشیدی بھی ہے اور جمیلہ بھی ہے۔ اسی طرح شوکت جاہ جب بظاہر انتقال کر جاتے ہیں، لیکن اپنے وفادار ملازم کی مدد سے بچ جاتے ہیں تو بھوت کے نام سے ''قمری سرائے'' میں مقیم رہتے ہیں اور ان کے کردار کی پراسراریت قاری کو تجسس اور دلچسپی کے حصار میں قید رکھتی ہے۔ جیسا کہ

شروع میں کہا گیا کہ انہوں نے اپنے ناول میں بہت ہی نچلے طبقے کے کردار بھی شامل کیے ہیں۔ ان کرداروں کے حرکات وسکنات کے علاوہ ان کی زبان بھی مخصوص طرز کی ہے۔ ذیل میں ایسے دو کرداروں کی گفتگو پیش کی جاتی ہے جس سے ان کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

کڑیل لالو : اچھا دوس، دیکھو تو کتنا بجا ہے، کائکہ (کیوں کہ) حمید یہ ہوٹل میں جانے ہوگا۔ اولکھس (اس نے لکھا) ہے نہ آٹ بجے آبے گا (اوے گا)۔

ڈینگیار ستم : وادا (وعدہ) تو کیس ہے، دیکھو آبے ہے کی (یا) نا۔

کڑیل لالو : آبے گا ضرور۔ جلدی نئی آئس تو دیری میں آبے گا۔

ڈینگیار ستم : آرا گرا ایک دم نئی آئس تب؟

کڑیل لالو : تب آر کیا، سمجھ جاؤ کہ کہیں نیا ملہ اوملہ جٹائس ہے۔

ڈینگیار ستم : کھوب آدمی پھنسیس ہے۔ ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ کام لے ہے۔

کڑیل لالو : مگر پلے درجہ کا چھٹا ہوا ہے۔ پچھّم کا آدمی مالوم ہوئے ہے۔

ڈنیگیار ستم : بس تم بھی تو آدمی کو کھوب پیچانو ہو۔ اتنا دن سے مچھوا بزار، کسائی ٹولہ، گنگا رام کا گلی میں رہیو مگر آدمی نئی پہچان سکیو، آؤ کچھ بدو ہو، ہم بولے ہیں کلکتیا ہے۔''

مذکورہ دونوں کرداروں کے مختصر سے مکالمے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی معاشرتی زندگی کیسی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جس زبان میں ان کی گفتگو ہوتی ہے، وہ کلکتہ کے ان ناخواندہ نچلے طبقے کے افراد کی زبان ہے، جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آکر یہاں بس گئے تھے۔ ان کی اپنی زبان اور یہاں کی مقامی زبان بنگلہ کی آمیزش سے ایک مخصوص زبان وجود میں آئی ہے۔ اس زبان کو عرف عام میں ''کلکتیا اردو'' کہتے ہیں۔ یہ زبان آج بھی عوام میں کثرت سے بولی جاتی ہے۔

بدرؔ کلکتوی نے اپنے ناول ''احسن'' میں جس طرح کرداروں کی بھیڑ اکٹھا کی ہے۔ بہت ممکن تھا وہ تمام کرداروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ انہوں نے چابکدستی کے ساتھ ہر کردار کو اپنی شخصیت اجاگر کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔

اس طرح بدرؔ کلکتوی کرداروں کی مدد سے انسانی زندگی کے پھیلاؤ، گہرائی اور الجھن، خواہ وہ الجھن داخلی جذبے کے تحت ہو، یا خارجی مسائل کے ذریعہ کو اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور یہ کوئی آسان کام بھی نہیں ہے کہ اس سے ہر ناول نگار بحسن وخوبی عہدہ برآ ہو سکے۔

منظر نگاری :

جس طرح مثنوی، مرثیہ اور ڈراما کے لیے منظر نگاری ایک اہم جزو ہے، اسی طرح ناول میں بھی منظر نگاری یا ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ناول نگار منظر وپس منظر کے ذریعہ ہی کر کرداروں کی سیرت اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ناول ''احسن'' میں بدرالزماں بدرؔ کلکتوی نے بڑی مہارت سے منظر نگاری کے ذریعہ کرداروں کو اجاگر کرنے، کہانی کو آگے بڑھانے اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ذیل کا اقتباس دیکھئے جس میں بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بنگال کے ہگلی اسٹیشن کا منظر پیش کیا گیا ہے:

> ''اس شہر کے اسٹیشن سے ایک راستہ بہت دور سیدھا چلا گیا ہے۔ جس کے دونوں جانب بڑے بڑے عالی شان درخت ہیں۔ داہنی جانب درختوں کے آس پاس کہیں کہیں پھوس کی جھونپڑیاں نظر آتی ہیں اور بائیں جانب ایک اونچا سا پُل ہے جس پر سے ٹرین جاتی ہے۔ یہ لائن نئی ہٹی اسٹیشن سے جا کر مل گئی ہے اس وقت..... شب کے دس بجے تھے۔ اندھیری رات کی ظلمت کسی عاشق کی تیرہ بختی کی طرح دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ خصوصاً ہگلی کے اس راستہ پر بالکل ہُو کا عالم اور چاروں طرف سناٹا تھا۔ مرزا فیروز بیگ اسی سنسان راستہ سے اپنی ناکامیوں پر افسوس کرتے ہوئے اور کرایہ کی گاڑی نہ ملنے پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے جارہے ہیں.....''

یہ منظر جہاں اس وقت کے ہنگلی کی تصویر دکھاتا ہے، وہیں ماحول کی سنگینی اور ہوس ناکی میں رونما ہونے والے واقعے کی فضا بھی تیار کرتا ہے، کیوں کہ اس منظر کے بعد ہی مرزا فیروز بیگ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ احسن کی بروقت موجودگی سے بچ جاتے ہیں۔ اس منظر سے ناول نگار نے جہاں احسن کو مرزا فیروز بیگ سے ایک بہادر نوجوان کی حیثیت سے متعارف کرانے کا کام لیا ہے، وہیں کہانی میں سسپنس بھی پیدا کیا ہے کہ قاری اس تجسس میں مبتلا رہے کہ آخر حملہ آور کون تھے اور کس بنا پر اس پر حملہ کیا تھا۔

مقصدیت/نظریے :

ناول کے اجزائے ترکیبی میں مقصدیت یا نظریے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ کوئی بھی فن پارہ بغیر مقصدیت یا نظریے کے تخلیق ہی نہیں پا سکتا۔ ادب کی تخلیق چونکہ انسان کرتا ہے اور تخلیق کار انسان ہونے کے ناتے ایک مخصوص سماج میں رہتا ہے اور اس کے اردگرد رہنے والے انسان اور ان کے معمولاتِ زندگی اور خود فن کار کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات یا اس کے ظاہر و باطن کی دنیا، دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اور جب فن کار انہی تاثرات کو الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر پیش کرتا ہے تو وہ ادب پارہ ہوتا ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین:

> ''.....ادیب کے گرد و پیش کی دنیا، اس کا حسن اور اس کی بدصورتی اس کی کشمکش اور اس کا الجھاؤ، اس میں بسنے والوں کی امیدیں اور مایوسیاں، خواب اور امنگیں، رنگ اور روپ، بہار اور خزاں، اس کے موضوع بنتے ہیں اور مختلف تاریخی ادوار میں انسانی جذبات سے ان کا تعلق یکساں نہیں ہوتا بلکہ انسان کی معاشی زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔''
>
> (ذوق، ادب اور شعور، ص۔۱۰۳)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادب اور نظریے یا مقصدیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئی بھی ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ فن کار کو خام مواد اپنے ماحول اور اردگرد سے ملتا ہے اور اسی خام مواد کا ادب پارہ بننے میں، فن کار کی مقصدیت بروئے کار آتی ہے۔ خواہ وہ مقصد حظ اٹھانے کا ہو یا ترسیل و تبلیغ کا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں جب ناول نگاری کی ابتدا ہوئی تو تمام اجزائے ترکیبی میں مقصدیت غالب رہی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں جو ناول لکھے گئے، ان میں بھی مقصدیت یا نظریے نمایاں رہے۔ لہٰذا بدرؔ کلکتوی کا ناول ''احسن'' بھی اس سے خالی نہیں ہے۔

چونکہ یہ زمانہ نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر کے بعد اور پریم چند کی ناول نگاری کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عہد میں بھی ناول نگاروں کے سامنے بنیادی مقاصد یہی تھے کہ وہ قوم کے اندر پھیلی ہوئی مذہبی کج روی اور سماجی برائیوں کی نشاندہی کر کے اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کا جو استحصال حکمراں طبقوں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا، اس کی نشاندہی کر کے عوام میں بیداری پیدا کی جائے۔

''احسن'' ناول میں بدرؔ کلکتوی کا نظریۂ انسانیت تقریباً ہر جگہ جھلکتا ہے۔ ناول کے ابتدائی حصہ، باب سوم میں عسکری صاحب کے مکان اور ان کے مخیّر اور فیاض ہونے کا ذکر کرتے ہوئے بدرؔ لکھتے ہیں:

> ''بے چارے غربا اور مساکین کی تعداد کلکتہ میں حساب سے باہر ہے مگر افسوس ان تو انگروں پر جو صدہا روپے جلسوں میلوں کی نذر کر دیتے ہیں اور بڑی بڑی رقمیں تھیٹر اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں اڑاتے پھرتے ہیں۔ کاش اس کی چوتھائی بھی بے چارے مساکین کو دے دیتے تو برسوں کے لیے ان کی روٹی کا سہارا بندھ جاتا۔ مگر نہیں، ان کو کیا پڑی ہے کہ کسی کارِ خیر میں روپے صرف کریں۔ ہاں لفظ (معاف کیجئے) تو بیشک ان بے کسوں کو متمولوں سے برابر ملتا ہے اور اس لفظ کے ادا کرنے میں بھی کسی قدر جھنجھلاہٹ سے منہ بناتے اور تیوریوں پر بل ڈالتے ہیں۔''

اسی طرح جب عورتوں کی وکالت کرتے ہیں تو بہت جذباتی ہو جاتے ہیں اور ان کا لہجہ خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ عورت کے لئے اس کی عصمت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور جب وہ لٹ جاتی ہے تو وہ ہر طرح سے معتوب ہوتی ہے:

> ''آہ! اے عورت! تیری ایک لغزش کی آخری منزل یہیں نہیں ہے۔ اس مقام پر چاہے اپنی معتبر ساتھیوں کی تحریک پر عمل کر کے

اپنی عصیاں کوضرب دیتی رہ۔ چاہے تائب اور نادم ہوکر مزدوری یا بھیک مانگ کر پیٹ بھر مگر وہ ایک داغ جو تیرے دامن عصمت پر لگ گیا، قیامت تک دھوئے نہ دھویا جائے گا۔تو مر بھی جائے تو تیرا نام برابر حقارت سے یاد کیا جائے گا۔''

یا پھر یہ اقتباس دیکھئے :

''مگر افسوس، اے قومِ نسواں! تیرے افراد میں سے اگر ایک سے کبھی لغزش ہوگئی تو پھر خیریت نظر نہیں آتی۔شوہر نے مکان سے نکال باہر کردیا۔ والدین کی شفقت کی نظریں قہر سے بدل گئیں۔''بے حیا، ننگِ خاندان! ڈوب مر، کیا تجھے کہیں زہر بھی نہیں ملتا'' ایسے الفاظ تیرے والدین کی زبان سے نکلتے ہیں۔شریف عورتوں میں تو بیٹھنے کے قابل نہیں سمجھی جاتی۔کوئی اپنی ناکتخدا لڑکی کو تیرے سامنے آنے نہیں دیتا۔''

یہ وہ معاشرتی اصول تھے جن پر اس زمانے میں بڑی سختی سے عمل درآمد کیے جارہے تھے۔ایک بار کسی لڑکی یا عورت سے لغزش ہوجاتی تو وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوجاتی تھی۔ایسے عالم میں کوئی اس کا پرسان حال تک نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے اس گناہ میں شریک ہونے والا بھی دامن جھاڑ کر معزز بن جاتا تھا اور تمام مصیبتیں، نفرتیں جھیلنے کو عورت اکیلی رہ جاتی تھی۔ بدرؔ کلکتوی نے ایسے ماحول اور نظریے کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی ہے اور بہت پر جوش لہجے میں عورتوں کو تنبیہ کی ہے کہ انہیں ہر حال میں اپنی عصمت کی حفاظت کرنی ہے۔

بدرؔ کے اس ناول میں مختلف طبقے، مزاج اور کردار کی عورتیں ہیں۔کہیں عورت معصوم اور وفا شعار ہے، (دلربا اور رابعہ)، تو کہیں بیوفا، جفا کار اور بدکار (شمسہ اور خورشیدی)۔اگر دیکھا جائے تو ناول کا پلاٹ مختلف عورتوں کی زندگی کے گرد گھومتا ہے، جس میں اس کے مختلف شیڈس نظر آتے ہیں۔

غرض، بدرالزماں بدرؔ کلکتوی کے ناول ''احسن'' میں نظریے اور مقصد دوسرے اجزائے ترکیبی کے ساتھ ہیں۔ان کا مدعا بھی تقریباً وہی ہے جو اس کے دوسرے ناول نگاروں کا تھا۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ معاشرے اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کا خاتمہ ہو اور مرد، عورت کا ازلی رشتہ یقین اور اعتماد کی ڈور میں مضبوطی سے بندھا رہے۔مرد، عورت کا استعمال نہ کرے اور عورت مرد کے اعتبار کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ مذہب انسان کو صالح بنانے کا کام انجام دے، گمراہ نہ کرے۔

زبان واسلوب :

ناول میں زبان کا مسئلہ جتنا پیچیدہ ہے، اتنا ہی آسان بھی۔پیچیدہ اس لیے کہ ناول نگار کو کردار کی زبان، اس کے روزمرہ، اس کے محاورے اور اس کے لہجے سے واقف ہونا ضروری ہے۔بغیر ان سب کے وہ اپنے کردار کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتا اور نہ ہی کہانی کو حقیقت کے قریب لاسکتا ہے۔اور آسان اس لئے کہ ناول نگار کردار کے حرکات وسکنات اور اس کے اعمال واطوار کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی استعمال کرتا جائے، بلکہ اپنے کردار کو اس کے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اپنی زبان استعمال کرنے کی آزادی دیدے۔ بقول سید جعفر رضا:

''کہانی میں اسلوب کی اہمیت اور مقام کی بحث میں تناسب کے اعتبار سے اختلاف ممکن ہے، لیکن اس کے افادی پہلوؤں سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ ہر ایک فقرہ واقعہ، ماحول اور کردار سے مطابقت نہ رکھے تو الفاظ کی کمی اور زیادتی سے تاثر مجروح ہوجاتا ہے۔ ہر ایک جملہ کو کسی نہ کسی شکل میں کہانی کے واقعے یا عمل سے منسلک ہونا چاہئے''

(پریم چند: کہانی کے رہنما، جعفر رضا، ص۔۶۱)

لیکن ناول کے ابتدائی دور میں، خصوصاً پریم چند سے بہت قبل سے لے کر ۲۰ ویں صدی کے ابتدائی برسوں تک ناول نگاروں کے پیش نظر مذکورہ اصول نہیں تھے۔ان کے تمام کرداروں کی زبان اکثر ایک جیسی ہوتی تھی۔ان کے ناولوں میں معمولی سے معمولی کردار بھی نفیس اور سلیس زبان بدلتے نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ناول نگار کے پیش نظر کردار سازی سے زیادہ زبان و بیان کی رنگینی اور چاشنی رہی ہو اور ناول نگار قصداً ایسی زبان استعمال کرتے ہوں، جس سے قاری کہانی کے ساتھ لسانی حظ بھی اٹھائے۔

ناول ''احسن'' میں جہاں ایک طرف روایت کی پاسداری کی گئی ہے اور ایسی زبان کا استعمال ہوا ہے جس سے ناول نگار کی زبان دانی اور وسعت مطالعہ کا

پتہ چلتا ہے۔ نیز یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ناول نگار کا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے، جو اردو کے اہم مراکز سے کوسوں دور ہے۔ تو دوسری طرف ناول نگار نے چند مقامی نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں سے ان کی زبان میں گفتگو کروا کر اپنی جدت طرازی کے ساتھ ساتھ کردار سازی میں حقیقت کا عنصر شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اردو ناول کے مذکورہ عناصر ترکیبی کی روشنی میں ''احسن'' کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں ۱۹۰۷ء کے ناولوں میں ''احسن'' کا مقام کچھ کم اہم نہیں ہے۔ جس طرح اس دور کے دوسرے ناولوں میں سماجی مسائل اور برائیوں کی نشاندہی کہانی کی شکل میں پیش کر کے اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔ ''احسن'' میں بھی عورتوں کے مختلف کرداروں کے ذریعہ ان کی اچھائیوں اور برائیوں کو موضوع بنا کر کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے، اور مسلمانوں کے اس طبقے کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے، جو نوابی کے خاتمے کے بعد ابھی تک انہی قدروں کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں، جسے شکست وریخت سے دوچار ہوئے نصف صدی گزر چکی تھی۔ بلکہ ایک نیا روشن دماغ طبقہ بھی سامنے آ چکا تھا جو جدید تعلیم سے بہرہ ور تھا۔ اس ناول میں اس حقیقت کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح معصوم اور سادہ لوح غریب انسان جعلی پیر اور مرشد کے جال میں پھنس کر اپنی زندگی اور عاقبت دونوں خراب کر لیتے ہیں۔ اس ناول میں اس وقت کے مسلم سماج کے کئی شیڈس ہیں، جو قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے میں کامیاب ہیں۔

اس کے بعد برسوں تک ناول نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی، یا اگر دی بھی گئی ہوگی تو اس بارے میں کوئی معلومات فراہم نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ توجہ دی ہی نہیں گئی ہو تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آغا حشر کاشمیری کا قیام کلکتہ (۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۴ء) اور ان کے ڈراموں کی شہرت نے ناول نگاری کو متاثر کیا ہو؟ کیونکہ ان دنوں جب آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے کلکتہ میں کھیلے جا رہے تھے تو کیا عوام اور کیا خواص، سب کی توجہ کا مرکز یہی ڈرامے تھے اور ایک ایک ڈرامے کے سیکڑوں شوز ہوتے تھے۔ ظاہر ہے، اس کے پیچھے عوامی مقبولیت کارفرما تھی۔

چاند تارا

انہی دنوں کا ایک ناول ''چاند تارا'' کے نام سے دستیاب ہوا ہے جس کے مصنف طالبؔ عشروی ہیں۔ اسے عصر جدید پریس نے شائع کیا ہے اور جو ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب میں سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن کتاب پر عام روشنائی سے ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۰ء درج ہے۔ یہ تاریخ دراصل اس شخص کی درج کردہ ہے جس نے یہ کتاب خریدی ہوگی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت دسمبر ۱۹۳۰ء سے کچھ قبل یا آس پاس ہوئی ہوگی۔ سرورق کی پشت پر جو عبارت درج ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول قسط وار اخبار 'عصر جدید' میں شائع ہوا ہے۔ وہ عبارت یوں ہے:

> ''چاند تارہ'' کو جو عام مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہوئی ہے اور ہر طبقہ کے قارئین کرام نے جس پسندیدگی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا ہے، اس پر ہم اپنے قدر دانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہزاروں قارئین کے بے حد مسلسل اور زبردست تقاضا اور اصرار ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم زیادہ جلدی کر کے اس کو آج کتاب کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔''

ناول کا پس منظر تاریخی ہے اور ماحول سلطان محمد بن تغلق (۱۳۵۱ء-۱۳۲۵ء) کا ہندوستان ہے یعنی چودھویں صدی عیسوی کی ابتدائی دو، تین دہائیوں سے لے کر نصف اوّل تک ہندوستان۔ اس عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنی دوری اور بے گانہ پن نہیں تھا جو بیسویں اور اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں نظر آتا ہے۔

پلاٹ

اس ناول کی کہانی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک مسلمان بے سہارا لڑکا چاند (جس کا اصل نام حسن ہے) کی پرورش ایک برہمن پنڈت گنگا رام کے گھر ہوتی ہے۔ وہ یہ جانتے ہوئے کہ یہ ایک مسلمان ہے' اسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیتے ہیں۔ وہ ان کے کھیت میں کام کرنے کے علاوہ ان کے باغ کی رکھوالی بھی کرتا ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے اور اپنا کھانا خود پکا کر کھاتا ہے۔ پنڈت گنگا رام کی ایک بیٹی تارا نام کی ہے جو چاندؔ سے عمر میں چھوٹی ہے۔ دونوں ایک ساتھ جوان ہوتے ہیں۔ تارا، چاندؔ کو 'بھائی' کہہ کر پکارتی ہے اور چاندؔ، تاراؔ کو 'دی دی مُنی' کہتا ہے۔ تاراؔ کو چاندؔ سے اک عجیب نوع کی اُنسیت ہو جاتی ہے جو رفتہ رفتہ خاموش محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ لاشعوری طور پر چاندؔ کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ چاند پر خصوصی توجہ دینے لگتی ہے، جسے چاند پسند نہیں

کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے مالک کی بیٹی ہے۔اسی دوران تارا کی نسبت راج کمار رگھورام سے طے پا جاتی ہے لیکن عین تقریب کے دن تارا کہیں روپوش ہو جاتی ہے اور بات ٹل جاتی ہے۔اس طرح تارا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے لیکن رگھورام کے دل میں یہ بات خلش بن کر رہ جاتی ہے اور وہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کس طرح تارا سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے۔حسن اتفاق سے پنڈت گنگا رام کسی کام سے دلّی جاتے ہیں' اسی دوران ایک دوپہر کو رگھورام اپنے چند لٹھ بازوں کے ساتھ' جن میں اس کا معتمد خاص دلاور خان بھی ہوتا ہے' کی مدد سے تارا کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اگرچہ چاند اپنی جوانمردی سے اکیلا ان لوگوں کا مقابلہ کرتا ہے لیکن دھوکے سے اس کے سر پر لاٹھی مار کر اسے بے ہوش کر دیتا ہے اور جمنا میں بہا دیتا ہے لیکن چاند کا پالتو کتا اس کے ساتھ دریا میں کود جاتا ہے۔

تارا، رگھوناتھ کی قید میں رہ کر جب یہ محسوس کر لیتی ہے کہ وہ اس کی شادی کے ارادے سے کسی طرح بچ نہیں سکتی ہے تو رگھوناتھ سے پانچ دن کی مہلت مانگ لیتی ہے اور ان پانچ دنوں میں وہ پاروتی اور دلاور خان (یہ دونوں رگھوناتھ کے ملازم ہیں) کی مدد سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔اُدھر دلّی سے واپس آ کر گنگا رام جب سارا ماجرا سنتے ہیں تو غصّہ سے لال ہو جاتے ہیں اور سیدھا رگھورام کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ سے اپنے نوکر (چاند) کی موت اور اپنی بیٹی کے اغوا کی شکایت کرے گا۔رگھورام گھبرا کر اسے پانچ ہزار اشرفیاں دے کر اس کا منہ بند کروانا چاہتا ہے لیکن گنگا رام کسی طرح راضی نہیں ہوتا اور گوپال نامی اپنے دوست کے ذریعہ سارا ماجرا بادشاہ محمد شاہ تک پہنچا دیتا ہے۔بادشاہ رگھورام کو سزائے موت کا حکم دیتا ہے لیکن گنگا رام بادشاہ سے اس کی جان بخشی کی درخواست کرتا ہے۔ادھر چاند کتے کی مدد سے بچ جاتا ہے اور آخر میں چاند اور تارا ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں۔

اس ناول میں روایتی انداز کو اپنایا گیا ہے۔بیشتر حصّے ڈراموں کی طرح مکالمہ کے فارم میں ہیں لیکن جو حصّہ بیانیہ ہے' اس میں اک طرح کی دلکشی اور کشش ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھئے :

> ''یہ وہی جگہ تھی' جہاں قریب اور دور کی بستیوں کے دھوبی آ کر کپڑے دھوتے تھے' اسلئے اس کنارے اور خصوصیت کے ساتھ دھوبی گھاٹ کے پاس بڑی بڑی مچھلیاں بڑی کثرت سے پائی جاتی تھیں اور رگھورام کے ظلم وستم نے ماہی گیروں کو ایسا ڈرا رکھا تھا کہ وہ ادھر کا کبھی رُخ بھی نہیں کرتے تھے۔''

آبرو

مائل ملیح آبادی اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں کہ ''۱۹۳۷ء میں میرے ماموں مولانا ملیح آبادی کلکتہ سے ملیح آباد آئے ہوئے تھے۔ان کے ساتھ کلکتہ چلا گیا۔'' مزید کہتے ہیں کہ :

> ''پتھر وادی (راستہ کے دعویدار) سرت چند چٹر جی کا ناول.....آگرہ کے دو نوجوان ساتھی تھے جو بنگالی جانتے تھے ان سے کہا۔ ''پتھر وادی'' کے کچھ حصّے ہندی میں کر کے سناؤ۔انہیں سن کر شوق ہوا کہ مجھے بھی لکھنا چاہئے لہذا اسی کو سامنے رکھ کر پہلا ناول کلکتہ میں ''آبرو'' نام کا لکھا۔پھر ''دیوداس'' کو دیکھکر ''نیا آدمی'' لکھا پھر ''برہمن کی بیٹی'' ''بڑی دیدی'' پھر ''ادھوری بات''۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ۱۹۵۱ء میں دہلی میں تھے۔اسلئے ان ناولوں، جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے، کا فرداً فرداً تجزیہ بنگال میں ناول نگاری کے ضمن میں ہونا چاہئے۔لیکن ''آبرو'' اور ''نیا آدمی'' کے علاوہ دوسرے تین ناول دستیاب نہیں ہو سکے۔اس لئے انہی دونوں پر ہی بات کی جائے گی۔

مائل ملیح آبادی کا یہ پہلا ناول ہے جسے انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ضبط تحریر میں لایا۔میرے پیش نظر جو نسخہ ہے اسکی اشاعت (بار دوم) فروری ۱۹۵۳ء میں ہوئی ہے۔اس ناول کے شروع میں مائل ملیح آبادی نے ایک صفحہ میں تمہید کے طور پر ذیل کی سطور درج کی ہیں:

> ''بنگال کا قحط ہندوستانی تاریخ کا وہ المیہ ہے جس نے غیر ملکی تسلط کی، غلام ملک سے بے پروائی اور نفرت کی ایک نئی تاریخ لکھ دی ہے۔ساتھ ہی یہ بات بھی دوپہر کی سورج کی طرح روشن کر دی ہے کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے نظام کو جب بھی موقع ملے گا اپنے ہی بھائیوں کے خون سے اپنا پیٹ بھر لینے میں ہچکچائے گا نہیں۔ہندوستان کی نئی اور عظیم تاریخ اسی وقت لکھی جا سکتی ہے جب غیر ملکی سامراج کے ساتھ ملکی سرمایہ داری اور جاگیرداری کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ایسا نہ ہوا تو غیر ملکی حکومت

کے خاتمہ کے بعد بھی اس براعظم میں چھوٹے بڑے بنگال دم توڑتے رہیں گے۔''

مذکورہ اقتباس سے جہاں ناول نگار کے ذہنی میلان کا پتہ چلتا ہے، وہیں اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ ناول کا موضوع کیا ہے۔ بنگال کے قحط کے موضوع پر اور بھی کہانیاں اور ناول لکھے گئے ہیں۔ یہ ناول بھی اسی موضوع پر ایک خوبصورت اور پُر اثر تخلیق ہے۔ لیکن اس کی جتنی پزیرائی ہونی چاہئے تھی، نہیں ہوئی۔ کہانی کا پلاٹ یوں ہے کہ بنگال کے ایک گاؤں میں اس قحط سے متاثر لوگ دانے دانے کو محتاج ہو گئے ہیں، اور بیشتر گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف نکل پڑے ہیں، جو گاؤں میں رہ گئے ہیں تو وہاں زمینداروں اور تاجروں کے ہاتھوں سیر دو سیر اناج کیلئے اپنی بہو بیٹیوں کی عزت تک قربان کرنے پر مجبور ہیں۔ انہی لوگوں میں ایک بوڑھا مزدور سروپ بھی ہے جس کا ایک بیٹا کیلاش اور بیٹی بندو ہے۔ بیٹا کلکتے میں نوکری کی غرض سے گیا تو پھر پلٹ کر گھر کی خبر نہیں لی۔ گاؤں میں سروپ کمار اور اسکی جوان بیٹی بندو رہ گئی۔ اناج کی قلت اور قحط دونوں نے باپ بیٹی کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مٹھی بھر اناج کیلئے مارا ماری ہو رہی تھی۔ گاؤں میں جو بڑے کسان یا غلّہ فروش تھے، منہ مانگے دام پر بھی ضرورت کے مطابق اناج نہیں دے رہے تھے۔ انہیں یہ امید تھی کہ قیمت اور بڑھے گی لیکن اناج کا فقدان گاؤں سے انسان کی تعداد گھٹا رہا تھا۔ لوگ بھوکے مر رہے تھے، یا گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف نکل پڑے تھے۔ بندو اپنے باپ کے کہنے پر زمیندار کامتا کے گھر اناج لانے جاتی ہے اور کامتا اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرنا چاہتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کامتا اس کے ہوش میں آنے پر اسے اناج دے کر رخصت کرتا ہے کہ اس واقعے کا وہ کسی سے ذکر نہ کرے۔ گھر پہنچ کر بندو چاول پکاتی ہے۔ وہ بالکل چپ چاپ رہتی ہے اور اپنے باپ سروپ کمار کو کھلا کر خود نہیں کھاتی ہے۔ بوڑھا باپ یہ خیال کرتا ہے کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے اور وہ اسی وقت ارادہ کر لیتا ہے کہ صبح وہ شہر کیلئے روانہ ہو جائے گا۔ وہ بندو کو ساتھ لے کر بیماری اور نقاہت کے ساتھ شہر تو کسی طرح پہنچ جاتا ہے لیکن وہاں پہنچ کر دم توڑ دیتا ہے۔ بندو کے بھائی کا بھی کوئی اتا پتا نہیں۔ بندو کو بے ہوشی کے عالم میں ایک مسلمان کوچوان رحمت اسے اپنے یہاں لے آتا ہے اور اسکی دیکھ بھال کرتا ہے۔ رحمت جہاں رہتا ہے وہاں کے مقامی ہندوؤں نے مالک مکان کالی بابو سے مل کر اسے وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا کہ ہندو لڑکی کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ جب رحمت نے ان لوگوں کی بات نہیں مانی تو اسکی گاڑی کو آگ لگا دی جس میں رحمت رات کو اس لئے سوتا تھا کہ لڑکی کمرے میں سوتی تھی۔ گاڑی جل کر خاک ہو گئی لیکن کسی طرح رحمت بچ گیا، لیکن کچھ زیادہ ہی جل گیا تھا۔ پھر وہ اپنی بیماری کے باوجود بندو کو مرد بنا کر اور اس کو رمیش بنا کر اپنے ایک کوچوان دوست شیام کے پاس رہنے چلا جاتا ہے جس کی ایک لڑکی سرلا ہے۔ اس دوران گاؤں میں کامتا بابو کو پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ اپنا جمع کیا ہوا غلّہ پنچائت بنا کر بھوکوں میں تقسیم کر کے سروپ کمار اور بندو کو ڈھونڈنے کلکتہ آتا ہے اور اتفاقاً بندو سے ملاقات ہوتی ہے۔ بندو اسے اپنے گھر لے آتی ہے جسے رحمت غلط سمجھتا ہے لیکن رحمت کی غلط فہمی تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتی ہے جب تمام احوال اسے معلوم ہوتے ہیں۔ شیام اور رمیش (بندو) گاڑی لیکر روز نکلتے تاکہ کچھ پیسے ہو جائیں۔ رحمت گھر ہی پر رہتا۔ شیام اور رمیش رات گئے تک نہیں لوٹے۔ صبح کو رحمت کا دولت غفور کوچوان آکر ان دونوں کے حادثے کے شکار ہو جانے کی اطلاع دیتا ہے کہ اس حادثہ میں شیام مارا گیا اور رمیش (بندو) زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئی۔ لیکن چوٹ معمولی تھی، اس لئے شام تک چھٹی مل گئی۔ اب اسے مرد بن کر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب تو وہی رحمت اور سرلا کی کفالت کر رہی تھی۔ آخر بات یہ ٹھہری کہ رحمت کے اچھے ہو جانے پر سرلا اور بندو اور کامتا بابو اور رحمت کو لیکر واپس گاؤں چلے جائیں گے اور وہ سب ٹرین پر سوار ہو کر گاؤں جاتے ہیں۔ تو ٹرین کی پٹریوں کے قریب اسٹیشنوں میں لاش ہی لاش نظر آتی ہے۔ یا پھر بھوک کے مارے لوگوں کی مدقوق صورتیں نظر آ رہی تھیں۔ گاڑی ایک جگہ رُکی جہاں اسٹیشن نہیں تھا۔ کھڑکی سے رحمت نے دیکھا کہ پاس کی گلی سے نوجوان کو ایک جتھا ہاتھوں میں ترنگا لئے نکلا اور انقلاب زندہ باد، روٹی دو اور آزادی دو کا نعرہ لگانے لگا۔ اتنے میں گاڑی سے انگریز فوجوں کا دستہ بھی اترا اور ان نوجوانوں پر لاٹھی اور بندوق کے دستے سے مارنا شروع کیا اور ان کے ہاتھوں سے ترنگے چھین کر پھینکنے لگا۔ ایک نوجوان نے انجن پر چڑھ کر ترنگا لہرا دیا۔ ایک سپاہی نے گولی چلائی اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ عمل دوسرے نے دہرایا اور اسکا بھی یہی انجام ہوا۔ اس بار جس نے ترنگا اٹھا کر انجن پر لہرا دیا وہ رحمت تھا، لیکن اس کا وہی انجام ہوا اور وہ وہیں ڈھیر۔ اسے مرتے دیکھ کر بندو دوڑی، اس سے یہ کہتی ہے کہ رحمت تم اکیلے نہیں جا سکتے، میں آ رہی ہوں، ترنگا اٹھا کر لہرانے اور وہ بھی وہیں ڈھیر۔ اور مرتے وقت اسکے منہ سے یہ الفاظ نکلے بھارت ماتا کی جئے۔ اور ایک لمحے بعد یہ ترنگا جھنڈا سرخ ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور ''سرلا اور کامتا نے ہاتھ جوڑ کر ان سبھی نے مرنے والوں کو آخری سلام کیا''۔ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

اس کہانی کو پڑھ کر جو تاثر ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ بنگال کا قحط فطری نہیں، بلکہ زمینداروں، جاگیرداروں اور سامراجی طاقتوں کی سازش تھی، جو انگریز کے

ساتھ ملے ہوئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اس نفسانفسی کے عالم میں بھی انسانیت کو چھوڑ کر لوگ مذہب کو ایک دوسرے سے لڑنے کا آلہ بنا رہے تھے۔ تیسری بات یہ کہ ہندستان کی آزادی میں کسی ایک مذہبی فرقہ یا ایک سیاسی پارٹی کا ہاتھ نہیں تھا۔ اگر ایک طرف ہندو اور مسلمان نے مل کر یہ جنگ لڑی اور قربانیاں دیں، تو دوسری طرف اس جنگ میں صرف کانگریس پارٹی ہی تنہا نہیں تھی بلکہ کمیونسٹ پارٹی بھی اسکے ساتھ ساتھ تھی۔

اس ناول کے کرداروں میں سروپ کمار، بندو، کامتابابو، رحمت، شیام اور کالی بابو خاص ہیں۔ ویسے ان کرداروں میں بندو اور رحمت دو اہم کردار ہیں جن کے گرد کہانی گردش کرتی ہے۔ یہاں مختصراً ان دونوں کرداروں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

بندو

بندو، سروپ کمار کی اکلوتی بیٹی ہے، جو گاؤں میں باپ کے ساتھ رہتی ہے اور گھر گرہستی کا کام انجام دیتی ہے۔ قحط سے متاثر سروپ کمار کے کہنے پر بندو جب کامتابابو کے یہاں چاول لانے جاتی ہے تو کامتابابو اسکے ساتھ بری حرکت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن بندو کے ہاتھ پکڑتے ہی وہ بے ہوش ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اسکی آبرو تو بچ جاتی ہے لیکن وہ ایک نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو جاتی ہے اور واپسی پر بالکل خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے سروپ کمار کو شک گزرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ لٹا چکی ہے۔ اس لئے وہ اسی وقت فیصلہ کرتا ہے کہ اگلی صبح کو گاؤں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ گرچہ بھوک اور نقاہت نے اسے اس قابل نہیں رکھا تھا کہ وہ سفر کر سکے، لیکن دوسری صبح وہ مختصر سامان کے ساتھ بندو کو لے کر کلکتہ روانہ ہو جاتا ہے۔ گاؤں سے نکل کر ابھی وہ آدھا راستہ ہی طے کرتا ہے کہ اسکی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اب بندو کے لئے دنیا اندھیری ہو گئی لیکن اس بات پر بضد تھی کہ چاہے اسکی جان چلی جائے، اپنی آبرو پر آنچ آنے نہیں دے گی۔ جب وہ بھوک سے بے حال راستے میں پڑی تھی تو اسے ایک رحمت نامی کوچوان اٹھا کر اپنے گھر لے آتا ہے۔ رحمت کے حسن اخلاق، خبر گیری اور دیکھ ریکھ سے وہ بے حد متاثر ہوتی ہے۔ کوچوان کے پاس ایک ہی کمرہ تھا جس میں اس کا گھوڑا بھی رہتا تھا اسلئے وہ باہر گاڑی میں سونے لگتا ہے۔ بندو کے دل میں اس کے لئے انسیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ اس کا اظہار کسی بھی طرح نہیں کرتی ہے۔ کچھ ہی دن گذرے کہ محلّے کے لوگوں کی نظر بندو پر پڑ گئی اور انہوں نے یہاں تک واویلا مچایا کہ رحمت کی گاڑی میں آگ لگا دی جس میں وہ سو رہا تھا۔ وہ تو بندو نے اس جل مرنے سے بچا لیا لیکن پھر بھی اسکے پاؤں کا زیادہ تر حصّہ جھلس گیا۔ جسکی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔ اب بندو کو ہی کچھ کرنا تھا۔ لہذا وہ مردانہ لباس میں رحمت کے ایک دوست شیام کی گاڑی ہانکنے کا کام انجام دینے لگی۔ اس طرح دو وقت کی روٹی مہیا کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ رحمت کی تیمارداری بھی بڑی دلجمعی سے کرتی۔ اس سے اس کے کردار کی ایک بڑی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ وہ کس حد تک فرماں بردار اور caring ہے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن اس کی گاڑی کسی فوجی گاڑی سے ٹکرا جاتی ہے جس میں موقع واردات پر دم توڑ دیتا ہے اور بندو (جو ابتک رمیش بنکر) شیام کے ساتھ کام کر رہی تھی، زخمی ہو جاتی ہے اسے اسپتال لے جایا جاتا ہے جہاں اسے معمولی مرہم پٹی کے بعد Discharge کر دیا جاتا ہے۔ ادھر وقت مقررہ پر بندو (رمیش) کے نہ لوٹنے پر رحمت بڑی تشویش میں رہتا ہے اور جب اسے یہ خبر ملتی ہے تو وہ بے چین ہو اٹھتا ہے۔ بندو کے واپس آنے پر یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ کامتابابو کے ساتھ واپس گاؤں لوٹ جائے لیکن وہ یہ اعلان کرتی ہے کہ وہ رحمت کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ آخر یہ طے پاتا ہے کہ مرحوم شیام کی بیٹی سرلا اور وہ دونوں کامتابابو ساتھ گاؤں جائیں گے اور وہیں رہیں گے۔ جب وہ لوگ ریل گاڑی پر سوار ہو کر گاؤں جا رہے تھے تو راستے میں کچھ انقلابیوں نے گاڑی روک ترنگا لہرانا چاہا۔ گاڑی میں سپاہیوں نے اتر کر ان پر گولی چلا دی۔ ان میں ایک وہیں ڈھیر ہو گیا۔ رحمت یہ منظر دیکھ کر بے قابو ہو گیا، وہ ترنگا اٹھا کر انجن میں لگانے کیلئے بڑھا اور کامیاب ہو ہی گیا تھا کہ سپاہی کی گولی اس کے سینے میں پار ہو گئی۔ بندو یہ کہتے ہوئے دوڑی ''رحمت تم اکیلے کیسے جا سکتے ہو، میں بھی تمہارے ساتھ آ رہی ہوں'' اور ترنگا اٹھا کر انجن میں لگا دیا لیکن سپاہی کی گولی نے اسے بھی وہیں ڈھیر کر دیا۔

بندو کا کردار کہانی میں بڑا جاندار ہے اور اس کا کردار رفتہ رفتہ ارتقاء پذیر ہوتا ہے۔ آخر میں ایک آئیڈیل انقلابی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسکی اپنی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ آبرو کو کسی حال میں داغ دار نہ ہونے دے گی۔ کامیاب ہوتی ہے۔ رحمت کیلئے اس کے دل میں اتنی جگہ اور اتنا پیار ہے کہ اسے جہاں ایک غیر متعصب اور احسان شناسی ظاہر کرتے ہیں، وہیں رحمت کی تیمارداری اور ساتھ ہی ساتھ کامتا کو معاف کر دینا، اسکے اعلی اخلاقی اوصاف کے حامل ہونا ظاہر کرتا ہے۔

رحمت

اسی طرح رحمتؔ کا کردار بھی اس ناول میں بڑا اہم ہے۔ وہ ہے تو ایک کوچوان، جو کالی باؔبو کے مکان کے ایک کمرے میں اپنے گھوڑے کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اس کے سینے میں ایک دردمند دل ہے اور جو قحط میں بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس سیاسی شعور بھی ہے اور حالات حاضرہ کی جانکاری بھی۔ وہ اپنے وطن سے بے حد محبت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح ملک سے انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے۔ اسے ان دیسی سامراجیوں اور جاگیرداروں سے بھی شکایت ہے جو انگریزوں کی ہم نوائی کرتے ہیں اور اپنے ہی لوگوں پر ستم ڈھاتے ہیں۔

اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب بندؔو سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ بندؔو کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ اس کی صحت کی اسے فکر رہتی ہے۔ وہ اس نفسانفسی کے عالم میں بھی اس کیلئے ساڑی خرید کر لاتا ہے۔ اُسے آرام دینے کیلئے خود باہر اپنی گاڑی میں سوتا ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں بندؔو کیلئے نرم گوشہ ہے لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ وہ انسانیت کا علم بردار ہے۔ اس کا دوست شیام جب حادثے کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ اسکی بیٹی سرؔلا کی بھی کفالت کرتا ہے۔

رحمتؔ اپنے دل کی گہرائیوں سے بندؔو کو چاہنے لگتا ہے۔ اسے پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ کامؔتا بابو کو اپنے گھر لے آتی ہے۔ یہ دیکھ کر رحمتؔ آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔ بندؔو ناراض تو ہوتی ہے لیکن دل میں خوشی بھی محسوس کرتی ہے۔ بندؔو دوران گفتگو یہ کہتی ہے۔ ''اس زندگی میں تمہارا ساتھ نہیں چھوٹ سکتا''۔ رحمت اس کا ہاتھ پکڑ کر کہتا ہے۔ ''سچ بندؔو، اس زندگی میں مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔''

''نہیں جاؤں گی۔ بھگوان گواہ ہیں''

''خدا گواہ کہ میں بھی تمہیں چھوڑوں گا نہیں''۔ کہہ کر رحمت نے بندؔو کا سر کھینچ کر اپنی گود میں لے لیا''۔

اس سے بندو کیلئے رحمت کے دل میں جہاں بے پناہ محبت کا پتہ چلتا ہے، وہیں اسکی سمجھداری اور معاملہ فہمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جب انقلابیوں کو دیکھکر اس کا بھی جذبۂ حب الوطنی شدّت اختیار کر لیتا اور وہ ریل کے انجن پر ترنگا لہرانے کیلئے اپنی جان دیتا ہے تو اسکے صالح جذبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح رحمت کا کردار بھی متحرک اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

اس ناول کا تانا بانا بننے میں مصنف نے بڑی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ بقول مصنف یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ناول نگاری کے فن کی پوری طرح پاس داری کی ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس ناول کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ ناول کے پلاٹ کو جس خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے اور کرداروں کی کارگزاریاں کچھ اتنی فطری ہیں کہ قاری بلا تکلف اور دلچسپی کے ساتھ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ ویسے کہیں کہیں منظر کشی، خصوصاً قحط سے متاثر افراد کی ہلاکت کے مناظر کی تکرار بار گزرتی ہے۔ موضوعاتی طور پر یہ بنگال کے قحط کی ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

نیا آدمی

نیا آدمی مائل ملیح آبادی کے بنگال میں لکھے جانے والے ناولوں میں ایک ہے۔ یہ ناول ۱۲/ابواب پر مشتمل ہے۔ اس ناول کا پلاٹ کچھ یوں ہے۔

ایک امیر زادی خاتون ہے جسکے والدین ایک ہی سال میں انتقال کر چکے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا بھائی فاروقؔ ہے، جو ابھی پانچویں جماعت میں پڑھ رہا ہے۔ خاتون کی زندگی پر اپنے والد کی زندگی کا اثر ہے۔ اس کے والد ''انگریزی سوسائٹی کو پسند کرتے تھے۔ اس لئے اسکی تربیت بھی اسی ڈھنگ پر ہوئی'' ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی اور والد زندگی کا جو ڈھانچہ بنا کر گئے تھے ''اسی پر وہ چل رہی تھی۔ کلب، سنیما، تھیٹر، دوستوں کا ہجوم، لکھنؤ کی سیر و تفریح'' یہی سب اسکی زندگی تھی۔ لوگ اسکی زندگی پر اعتراض کرتے لیکن خاتون کو اپنے کریکٹر پر ناز تھا۔ اور اگر نوکری میں کوئی اس پر در پردہ بھی معترض ہوتا تو وہ اسے ایک دن بھی نہیں رکھتی، فوراً نکال باہر کرتی۔

لیکن ایک دفعہ ایک ایسا نوکر آیا جس نے نہ صرف اسکی اس آزادی پر اعتراض کیا بلکہ اسکے چھوٹے بھائی کو بھی اس سے بدظن کر دیا۔ جسکے نتیجے میں ایک دن جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح پر جانے والی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی فاروق گیٹ پر ریوالور تان کر کھڑا ہو گیا کہ اگر خاتون اپنے دوستوں کے ساتھ جائے

گی تو وہ گولی مار دے گا۔ جب خاتون کو یہ معلوم ہوا کہ اس عمل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے، تو اس نے فوراً اس نئے نوکر (محبوب) کو نکال دیا۔ جب فاروق کو معلوم ہوا کہ نیا آدمی (محبوب) چلا گیا ہے تو اسکی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اِدھر خاتون، فاروق کو پورے شہر میں تلاش کرتی پھری لیکن اسکا کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر دوسرے دن چلچلاتی دھوپ میں نیا آدمی (محبوب) فاروق کو گود میں لے کر آیا جو بخار میں مبتلا تھا۔ اب خاتوں نے سمجھ لیا کہ محبوب (نیا آدمی) کو نکالنا آسان کام نہیں ہے۔ اِدھر خاتون کے ایک دوست مسٹر حسن، جو خاتون کیلئے نرم گوشہ اپنے دل میں رکھتا تھا، نے یہ یقین دلایا کہ وہ تین دنوں کے اندر نئے آدمی (محبوب) کو گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور کر دے گا۔ (مسٹر حسن نے خاتون کو اپنانے کی بات کہی تو خاتون نے اسے فوراً رد کر دیا۔ بعد میں مسٹر حسن نے اسے اپنا بنالیا۔) پھر مسٹر حسن نے محبوب پر غنڈے لگا دیئے اور تین غنڈوں نے محبوب (نیا آدمی) کو اس وقت گھیر کر خوب پٹائی کی جب وہ فاروق کو اسکول پہنچا کر واپس آ رہا تھا۔ محبوب کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں اسکی حالت نازک بتائی گئی۔ بطور گارجین خاتون کو بلایا گیا۔ خاتون جب وہاں پہنچی تو اسکی حالت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر مہربانی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تمام نوکروں کے دل میں یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ محبوب پر حملہ خاتون نے کروایا ہے۔ اور اسے خود اس کا خوف بھی تھا کہ نیا آدمی (محبوب) بھی یہی سمجھ رہا ہوگا۔ لیکن جب وہ اس سے اسپتال میں ملی تو اسے راحت محسوس ہوئی کیونکہ نیا آدمی کا دل اس کے خلاف بد گمان نہیں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد محبوب اچھا ہو کر اپنا گاؤں چلا گیا۔ لیکن اس دوران دونوں کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ یہ چاہت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ لہذا محبوب نے گاؤں پہنچ کر نازک سے شادی کر لی۔ یہ رشتہ بچپن سے لگا ہوا تھا۔ ادھر خاتون نے اپنی تنہائی کو مٹانے کیلئے اپنے ماموں کے گھر دلی چلی گئی۔ دلی جاتے ہوئے ریل میں اسکی ملاقات نجمہ کی جوان شادی شدہ لڑکی سے ہوتی ہے اور دوستی ہو جاتی ہے۔ حسن اتفاق سے وہ بھی اسی علاقے کے رہنے والی ہوتی ہے، جہاں اسکے ماموں رہتے ہیں۔ بلکہ اسکی ماموں زاد بہنوں سے اسکی دوستی بھی رہتی ہے۔ نجمہ کے والد قمر جمال ادھیڑ عمر کے ہیں۔ نجمہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دلی کے قیام کے دوران خاتون جب نجمہ کے قریب ہوگئی اور قمر جمال سے بھی گفتگو کرنے لگی تو اس نے قمر جمال کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اس کے نکاح میں جانا چاہتی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب بھی وہ اپنے اندر قمر جمال کے تئیں ایمانداری نہیں پائے گی، طلاق لے لے گی۔ قمر صاحب اس شرط کے ساتھ تیار ہو گئے۔ دلی میں کچھ دن رہنے کے بعد دونوں واپس لکھنو آ گئے اور پھر نازک کے بلوانے پر اس کے گاؤں بھی دونوں گئے۔ وہاں جا کر محبوب کی جو حالت دیکھی اور اسے جس طرح نشے کا عادی پایا کہ اور کچھ دن وہاں اسے چھوڑ دیا گیا تو اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ خاتون اسے لکھنؤ لے آتی ہے اور اپنے یہاں رکھ اس کا علاج کراتی ہے۔ یہ بات قمر جمال کو پسند نہیں آتی ہے اور ایک صبح لکھنؤ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور شاہجہاں پور سے خط کے ذریعے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ خاتوں کو آزاد کرتے ہیں اور اپنی بقیہ زندگی دنیا کی سیر کے ارادے سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ خط پڑھ کر خاتون زار و قطار رونے لگتی ہے۔ اتنے میں نازک اور محبوب بھی اس کے کمرے میں جاتے ہیں اور پھر حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے تینوں نے ایک ساتھ رہنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں۔

مذکورہ پلاٹ میں جو بات سب سے اہم نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ کہانی کار نے بڑی خوبصورتی سے کردار سازی کی ہے۔ کوئی کردار ایسا نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ کہانی کار کے حکم کے تابع ہے۔ بلکہ تقریباً تمام کردار حالات اور واقعات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، چاہے وہ خاتون کا کردار ہو، یا محبوب کا۔ حالانکہ یہ دونوں کردار ناول کے مرکزی کردار ہیں جن کے گرد کہانی گردش کرتی ہے۔ پھر یہ دونوں کردار حالات اور واقعات کے ساتھ اپنے اندر بدلنے کی فطری خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ حالانکہ محبوب کا کردار بڑا با اصول ہے پھر بھی اپنے اندر لچک رکھتا ہے۔ بقول نسیم انہونوی (جو اس ناول کے ناشر ہیں) :

''خاتون اور نئے آدمی (محبوب) کے کردار کو جس چابکدستی سے مائل صاحب پیش کیا ہے، یہ دراصل انہیں کا حصہ ہے''۔

ایک طرف خاتون اگر آزاد رہتے ہوئے بھی شریف ہندوستانی مسلم لڑکی کی طرح اپنے کردار کی پاکیزگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہے، تو دوسری طرف نیا آدمی (محبوب) خاتون سے نفرت کرتے ہوئے اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غرض، یہ ناول دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

بزم آرا

اس کے بعد جو ناول ملتا ہے، وہ ہے ''بزم آرا'' جس کے مصنف عثمانی صاحب ہیں۔ اس ناول کی بھی ناشر عصر جدید بک ایجنسی ہے۔ سن اشاعت ندارد ہے لیکن زیر مطالعہ نسخے کے آخر میں مالکِ کتاب ابوالخیر مظہر الحق کے انگریزی میں دستخط ہیں۔ اس کے نیچے 26.7.43 کی تاریخ درج ہے جس سے یہ بخوبی

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ناول مذکورہ تاریخ سے قبل ہی شائع ہوا ہے۔اس ناول کا پلاٹ کچھ یوں ہے:

پلاٹ

ڈاکٹر یوسف ایک شریف آدمی ہیں جن کی بیوی عقیلہ، دولڑکیاں نجمہ اور زہرا اور ایک لڑکا حسّو ہے۔ان کے یہاں ایک پرانا ملازم کلّو بھی ہے۔ڈاکٹر یوسف کی زندگی بڑے مزے سے اپنے خاندان کے ساتھ گزر رہی تھی کہ ڈاکٹر یوسف کی دوستی سیٹھ کریم جی اور مرزا صاحب سے ہوجاتی ہے۔یہ دونوں ڈاکٹر یوسف کو عیاشی کے راستے پر لگا دیتے ہیں جس میں شراب کا پینا، جوا اور ریس کا کھیلنا اور طوائف کے کوٹھے پر مجرا سننے جانا، سبھی کچھ شامل ہے۔سیٹھ کریم جی کی رکھیل بزم آرا سے ڈاکٹر یوسف کو قلبی لگاؤ ہوجاتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کی قربت میں گزارنا چاہتے ہیں۔لہذا ڈسپنسری بند کرنے کے بعد رات گئے تک انہی محفلوں میں ان کا وقت گزرتا ہے۔ان کے دوستوں میں بنرجی بابو جو کنوارے ہیں اور اپنے نوکر ہری چرن کے ساتھ رہتے ہیں، بھی شامل ہیں اور ایک بنگالن سوشیلا بھی، جو ڈاکٹر یوسف سے خاموش محبت کرتی ہے، جبکہ بنرجی بابو، سوشیلا کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں۔ادھر ڈاکٹر یوسف، بزم آرا پر جان دینے لگتے ہیں۔محفل شبینہ کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ ایک رات سیٹھ کریم جی کے بنگلے میں ڈاکٹر یوسف کچھ زیادہ ہی پی لیتے ہیں اور اس قابل نہیں رہتے کہ گھر جاسکیں، اس لئے چارپائی ڈال کر انہیں وہیں سلا دیا جاتا ہے۔جب صبح ڈاکٹر یوسف کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنی بغل میں ایک خون سے لت پت لاش دیکھتے ہیں۔ان کے ہاتھ میں بھی خون لگا ہوتا ہے اور ایک خون آلود خنجر ان کے پاس پڑا ہوا ہوتا ہے اور یہ شور ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر یوسف نے چندرمل جو کہ سیٹھ کریم جی کے دوست تھے، کا خون کردیا۔قتل کے جرم میں ڈاکٹر یوسف گرفتار کرلئے جاتے ہیں۔سیٹھ کریم جی اپنے نوکر اور اس کے بیٹے اور بزم آرا سے جھوٹی گواہی دلواتے ہیں کہ چندرمل کا خون ڈاکٹر یوسف نے کیا ہے، اسی دوران صورت سنگھ نام کا ایک شخص ڈاکٹر یوسف کی مدد کے لئے آتا ہے اور پورے کیس کے دوران ڈاکٹر یوسف کے بال بچوں کی خبر گیری کے ساتھ ساتھ کیس کی پیروی میں بھی مدد کرتا ہے۔وہ اپنے آپ کو ڈاکٹر یوسف کا دوست بتاتا ہے۔سخت کوششوں کے بعد آخر ڈاکٹر یوسف قتل کے الزام سے باعزت بری ہوجاتے ہیں اور اپنے بال بچوں کے درمیان لوٹ آتے ہیں۔بزم آرا اور سیٹھ کریم جی رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں۔بنرجی بابو، سوشیلا کی تلاش میں بنارس چلے جاتے ہیں اور آخر میں یہ پتا چلتا ہے کہ صورت سنگھ دراصل سوشیلا ہے جو ڈاکٹر یوسف کی مدد کے لئے بھیس بدلتی ہے۔بنارس سے بنرجی بابو کلکتہ چلے آتے ہیں اور وہ دونوں، بنرجی بابو اور سوشیلا نے مل کر ایک وِدھوا آشرم کھولتے ہیں اور اس کی ترقی میں تن من اور دھن سے لگ جاتے ہیں۔

یہ ایک سبق آموز ناول ہے جو بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔اس ناول کے کردار زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار ہمارے آس پاس ہی کے ہیں اور ان کے اندر خیر و شر کی انسانی خصوصیت موجود ہے۔ناول کی زبان سلیس اور صاف ہے اور اندازِ تحریر خوبصورت ہے، گرچہ مکالماتی ہے۔نمونہ ملاحظہ کیجئے:

> ''آج بھی وہ حسب معمول کچہری سے فارغ ہوکر چلا تو پہلے اس نے سوچا کہ گھر نہیں جانا چاہئے کیوں کہ جانے کے بعد خاموش رہنا ممکن نہیں اور اگر گھر میں بہن (عقیلہ) کو اور بچوں کو مقدمہ کی حالت کی خبر ہوگئی تو وہ بے موت مرجائیں گے۔یہ سوچ کر وہ ڈسپنسری کی طرف چلا۔سوچ میں وہ اس طرح غرق تھا کہ کالج اسٹریٹ کی طرف مڑنے کا خیال ہی نہیں۔بوبازار کی طرف چلا گیا۔چند قدم آگے بڑھ کر اس کو ہوش آیا کہ ایں! میں کدھر جارہا ہوں، یہ تو چور بازار سامنے ہے۔واپس ہونے کو تھا کہ بزم آرا کا نوکر دوڑا دوڑا سامنے آیا اور کہا کہ آپ کو بزم آرا بلا رہی ہیں۔''

اس سے قبل کہ حضرت جمیل مظہری کا ناول یا ناولٹ ''شکست و فتح'' کا ذکر کروں، اس کی وضاحت کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض حضرات ل۔احمد اکبرآبادی کی تخلیقات میں ان کی کتاب، محبت کا افسانہ، کو ان کے طبع زاد ناول یا ناولٹ سے تعبیر کرتے ہیں، جو درست نہیں۔کیونکہ مصنف کے خود اپنے حالات جو ''میری سرگزشت'' کے عنوان سے رسالہ ''تحریر'' میں ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئے، اس میں انھوں نے اپنی تخلیقات کی فہرست میں پانچویں تخلیق ''محبت کا افسانہ'' کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ انگریزی ناولٹ کا چربہ ہے۔''

ایسے میں اسے بنگال میں لکھے گئے طبع زاد ناول کے زمرے میں شامل کرنا کہاں تک مناسب ہے؟

شکست و فتح

جمیل مظہری کا ناولٹ ''شکست و فتح'' (جسے مالک رام نے 'طویل مختصر افسانہ' کہا ہے) دو قسطوں میں رسالہ 'ندیم' گیا کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء میں بالترتیب شائع ہوا۔ اس سے قبل اس ناولٹ کا عنوان 'فرض کی قربان گاہ پر' تھا جسے بعد میں جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی سیّد رضا مظہری نے' جو کلکتہ مدرسہ میں سینئر ٹیچر تھے اور بالآخر ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے، مئی ۱۹۵۰ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔ یہ ناول ۱۱۲ صفحات کا ہے، جن میں ۵۶ صفحات پر ۵ خطوط پھیلے ہوئے ہیں یعنی ناول کا نصف حصّہ خطوط پر مشتمل ہے۔ پہلا خط صفحہ ۱۹ سے شروع ہوتا ہے جو محمود، سلیمہ کو لکھتا ہے اور صفحہ ۲۳ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے خط کا جواب سلیمہ دیتی ہے جو صفحہ ۲۴ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۳۴ پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا خط سلیمہ پھر محمود کو لکھتی ہے جسکا جواب محمود یہ شعر لکھ کر دیتا ہے :

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

اسکے بعد چوتھا خط صفحہ ۷۶ سے شروع ہوتا ہے جو محمود ہی لکھتا ہے اور صفحہ ۹۰ پر ختم ہوتا ہے۔ پھر اس خط کا جواب سلیمہ دیتی ہے جو صفحہ ۹۲ سے لیکر ناول کے اختتام یعنی صفحہ ۱۱۲ تک، پھیلا ہوا ہے۔

پلاٹ

ناولٹ 'شکست و فتح' کا پلاٹ عشق کی تثلیث ہے عموماً ایک لڑکا اور دو لڑکیاں یا ایک لڑکی اور دو لڑکے ہوتے ہیں۔ کہانی انہی تینوں کرداروں کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اس کہانی میں بھی دو نوجوان ہیں جو آپس میں سگے بھائی ہیں۔ بڑا بھائی حامد، چھوٹا محمود اور لڑکی سلیمہ ہے جو ان کی قرابت دار ہے۔ تینوں ایک ساتھ جوان ہوتے ہیں۔ سلیمہ کی دلچسپی محمود میں ہے لیکن شادی کی بات حامد سے ہوتی ہے کیونکہ محمود' سلیمہ سے چند ماہ چھوٹا ہے اور اس طرح وہ حامد کے نکاح میں چلی جاتی ہے جو ایک بیرسٹر ہے اور جو ہر عمل اور بات کو عقل اور دلائل کی ترازو میں تولتا ہے جبکہ محمود کی زندگی کا مقصد ادب' شاعری ہے اور جب صورت ایسی ہو تو وہاں عقل کی رہنمائی سے زیادہ دل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ سلیمہ جیسی حسین لڑکی، جس کے متعلق جمیل مظہری فرماتے ہیں:

> ''سلیمہ کا وجود شاخِ نازک کی رنگین پنکھڑی پہ پڑا ہوا اک روش و تابناک شبنمی قطرہ ہے جو ہر لحہ بادِ مخالف اور سورج کی تیز کرنوں سے ترساں اور لرزاں نظر آتا ہے۔ پورے ناولٹ پر سلیمہ کی شخصیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ قاری اس کردار کے رنگ و بو میں کھو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی شخصیت میں جو درد و کرب ہے' جو گرمی و دل گدازی ہے' وہ قاری کو گہرے طور پر متاثر کرتی ہے۔ سلیمہ کا دل شمع کی لو کی طرح جلتا بھی ہے اور روشنی بھی دیتا ہے۔''
>
> (ص:۱۸۷)

سلیمہ کا کردار مسلم معاشرے کی ایک مہذب لڑکی کا کردار ہے جو اپنی محبت کو طشت از بام نہیں کرتی اور نہ اپنے شریک حیات سے بے وفائی کرتی ہے بلکہ اپنے من مندر میں اپنے محبوب کو بٹھا کر پوجا کرتی ہے۔ لیکن اپنی ازدواجی زندگی تلخ نہیں بناتی اور اس وقت ثابت قدمی کا ثبوت دیتی ہے' جب اپنے محبوب محمود کی زندگی کو بربادی کی راہ پر گامزن دیکھتی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ جذبات سے بالکل عاری ہے بلکہ اپنے جذبات کے رہوار کو قابو میں رکھنا جانتی ہے' جب کہ اس کا محبوب محمود ایک رومانی کردار ہے جو عشق تو کرتا ہے لیکن اپنے عشق کو کامیاب بنانے کے لئے عملی بغاوت نہیں کرتا بلکہ عشقیہ داستان کے ہیرو کی طرح ایک مجہول کردار ہے جو اپنی دنیا' اپنی آنکھوں کے سامنے لُٹتا دیکھتا تو ہے لیکن اسے مٹنے سے بچانے کے لئے عمل نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو تباہ کرنے لگتا ہے اور ایک لایعنی تصور یعنی 'آوا گون' کا سہارا لینے لگتا ہے۔

حامد

سلیمہ خود راوی کی حیثیت سے حامد کا تعارف اس طرح کراتی ہے :

> ''میرا افسانۂ حیات میرے شوہر کے بغیر نامکمل ہے۔ اسلئے آیئے آج ان کا (حامد) تعارف آپ لوگوں سے کرایا جائے۔ تندرست ہاتھ پاؤں مگر غیر تناسب خدوخال کا معمولی آدمی' فطرت نے جس کے چہرے کی سجاوٹ میں ذرا بھی فیاضی سے

کام نہ لیا ہے.....سر بڑا مگر پیشانی چھوٹی..... آنکھیں سیاہ اور بڑی لیکن کیفیت سے خالی.....مونچھیں خوبصورت مگر ہونٹ بدنما.....یہ تھا میرے شوہر ڈاکٹر حامد حسین بیرسٹر کا حلیہ ظاہری..... اب رہے خصائل باطنی سوایسی طبیعت کا آدمی میری برادری میں تو کوئی نہ تھا۔خدا کی اس لمبی چوڑی دنیا میں ہوتو مجھے انکار نہیں۔ایک ایسی طبیعت کا آدمی جس نے زندگی میں ایک بار کسی حاجت مند کے سوال کا نفی میں جواب نہ دیا ہو۔جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے میں اس درجہ فیاض ہو کہ آپ اپنی شخصیت کو بھول جاتا ہو۔جس کے نوکروں کو یہ حسرت رہ گئی ہو کہ ان کا مالک ایک بار بھی ان سے جھڑک کر گفتگو کرتا جس کی بیوی کو یہ ارمان رہ گیا ہو کہ ازدواجی زندگی کے دس سالوں میں ایک بار بھی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھتی.....جس نے جاڑے کی سرد رات میں اپنا لحاف ایک سردی سے کانپتے ہوئے فقیر کو دے دیا ہو اور خود ساری رات اور کوٹ اوڑھ کر بسر کی ہو۔جس نے عید کے دن اپنے بچوں کو غریب دوست کے یہاں بھیجتے ہوئے ان کے قیمتی کپڑے اس لئے اتار لئے ہوں کہ ان کا لباس دیکھ کر اس کے گھر کے بچوں کا غمزدہ دل کڑھے گا.....جو اپنی بذلہ سنجی کیلئے اس درجہ مشہور ہو کہ بغیر اس کے شہر کی محفلیں ہمیشہ سنسان سمجھی گئی ہوں۔جس کی علمی صلاحیتوں کا یہ حال ہو کہ مورخوں میں مورخ، شاعروں میں شاعر، فلسفیوں میں فلسفی بن جاتا ہو جس نے ملک کے سیاسی ہنگاموں میں حصّہ لیا ہو اور اپنی پالیسی پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود اپنی خوش طبعی سے تمام مختلف الخیال جماعتوں کا محبوب بنا رہا ہو۔اس مزاج اور ایسی طبیعت اور ایسی صلاحیت کا آدمی یقیناً پوجنے کی چیز تھا۔''

محمود

محمود کے کردار کے متعلق بھی سلیمہ ہی راوی ہے۔کیونکہ دونوں ہم جولی تھے۔سلیمہ صرف چند ماہ اس سے بڑی تھی۔بقول سلیمہ ''محمود کو فضول بکواس کی بیماری تھی۔''اور اس پر جب بولنے کا دورہ پڑتا تو بے تکان بولتا رہتا۔''محمود لاکھ مرد سہی لیکن اتنا غبی نہ تھا کہ میرے اچٹے ہوئے تیور کو تاڑ نہ لیتا۔میری بے رخی نے آہستہ آہستہ اس کو بھی خودداری سکھلا دی اور اس نے میرے پاس آنا اور بیٹھنا بالکل ترک کر دیا۔''

''تمہارے بھیاّ کی ذات میرے اور تمہارے درمیان میں ایک دیوار کی طرح حائل ہو جانے والی ہے پھر کس امید پر بڑھے آرہے ہو؟ محمود نے اس کے جواب میں سر ہلا کر کہا ''یہ نہیں ہونے دونگا''.....لیکن وقت نے آکر یہ ثابت کر دیا کہ یہ خوبصورت ہاتھ پاؤں کا خوبصورت مجسّمہ کچھ نہ تھا مگر بالو کا ایک تودا۔''

اب دیکھئے محمود اپنے متعلق کیا کہتا ہے :

''میرے دوستوں میں ایک صاحب ڈاکٹر ہیں۔ان کی تشخیص ہے کہ میرے جسم میں شکر کے عناصر کم ہو رہے ہیں۔زندگی کی وہ گنی ہوئی سانسیں جو گننے کیلئے ودیعت کی جاتی ہیں ان کی گنتی کو جلدی جلدی ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

''.....نفس کو خود اعتمادی کا سبق سکھلانے کیلئے ایک دفتر میں ملازمت کر لی ہے۔صبح سے شام تک دماغ کو قلم کے اشاروں پر لگائے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔شام ہوتی ہے تو سمندر کی طرف نکل جاتا ہوں مجھے اس کی گہرائیوں میں عافیت نظر آتی ہے۔لیکن وہاں تک پہونچ نہیں سکتا قدم بڑھاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے..... شاید ڈر کسی دن نکل جائے اور زندگی کا یہ کٹھن سفر بحری راستہ سے بہ آسانی طے ہو جائے۔رات ہوتے ہی یہ یاد آتا ہے کہ پروین منتظر ہوگی چونکہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اپنے انتظار کی تکلیف دوں اس لئے وہاں سے اٹھ کر اس کے گھر کی راہ لیتا ہوں وہاں پروین ہوتی ہے۔اس کی رعنائیاں ہوتی ہیں۔ساز ہائے موسیقی اور لوریاں ہوتی ہیں اور شراب کی رنگین گلاس ہوتے ہیں اور میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کے تمام ہنگاموں کو اپنے وجود اپنی خودی کو یہاں تک کہ تمکو تمہارے تصورات کو شراب کے انہیں گلاسوں میں غرق کر دیتا ہوں..... صبح ہوتے ہی زندگی کی تمام کیفیتیں جاگ اٹھتی ہیں اور میرے دماغ سے اپنا خراج مانگنے لگتی ہیں۔یہ ہے میری روزانہ کی زندگی اور اس کا نظام اوقات.....بھاگ جاؤنگا، اتنی تیزی سے بھاگوں گا کہ تم پیچھا نہ کر سکو۔اتنی دور نکل جاؤنگا کہ کئی زندگیاں میرے اور

تمہارے در میں حائل ہو جاتیں۔''

ان دونوں کرداروں میں کوئی خاص بات نہیں۔ کیونکہ دونوں کردار ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود کوئی تاثر نہیں چھوڑتے۔ محمود کے کردار میں عشق کی وارفتگی سے پیدا احساس کی جھلک تو ملتی ہے اور اسکے فنافی العشق ہونے میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اور یہی عشق میں خود کو فنا کر دینے کی خواہش اور جذبے کی وجہ سے قاری سے تھوڑی بہت ہمدردی مل جاتی ہے۔ جبکہ حامد کا کردار بالکل اکہرا کردار ہے۔ نہ تو اس کے اندر اپنی شریک حیات کو سمجھنے اور اس کے اندر جھانک کر دیکھنے کی صلاحیت ہے، اور نہ احساس کا نور ہے جس کی مدد سے اسکے دل کے نہاں خانے کا جائزہ لے سکتا ہے۔ وہ ایک میکانکی کردار ہے جو صرف اس کے حسن اور جسم سے حظ اُٹھانے تک ہی محدود ہے۔

غرض' یہ ناولٹ سوائے سلیمہ کی کردار نگاری کے، ناول کے دوسرے لوازمات سے عاری ہے۔

اس کے بعد ایک دہائی تک کسی ناول کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ہوسکتا ہے آزادی کے فوراً بعد بنگال جس طرح متاثر ہوا اور جو سیاسی اُتھل پتھل ہوئی' ملک کی تقسیم سے لے کر تبادلۂ آبادی تک' اس نے یہاں کے اُردو داں طبقہ کو بُری طرح متاثر کیا ہو۔ اُردو مراکز میں اُردو کو نکالا جا رہا تھا کیونکہ دیارِ غیر کی سرکاری زبان اُردو بنادی گئی تھی اور وہ اپنے وطن میں غیر ہو کر رہ گئی تھی۔ بنگال کے ساتھ تو معاملہ ہی دوسرا تھا' اس لئے کہ یہاں کے اُردو داں طبقہ کے بیشتر افراد ہجرت کر گئے تھے اور جو بچے کچھے تھے' وہ اتنے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے کہ ادبی تخلیق کی طرف توجہ دینے کی جسارت بھی نہیں کر سکتے تھے اور وہ بھی ناول کی صورت میں۔ ہاں' شاعری اور خصوصاً غزل گوئی کی ایک نیم جان دنیا ضرور آباد تھی۔

بعدہٗ اب تک کی تحقیق و تلاش کے، جو ناول آزادی کے بعد کے دستیاب ہوئے ہیں' وہ ۱۹۶۰ء کے بعد ہی کے لکھے ہوئے ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے :

۱	سرلا	بیگم مرزا احمد علی	۱۹۶۰ء
۲	آخری شکست	جان عالم سیف	۱۹۶۰ء
۳	پھول بنے انگارے	سجاد نظر	۱۹۶۱ء
۴	روپ متی	جان عالم سیف	۱۹۶۱ء
۵	پیاسے دل	ابراہیم اختر	۱۹۶۲ء
۶	وائسرائے کپ	مائل لکھنوی	۱۹۶۴ء
۷	خواب بے داری	ایس۔ کے۔ صغریٰ سبزواری	۱۹۶۷ء
۸	موت کا سایہ	ایس۔ کے۔ صغریٰ سبزواری	۱۹۷۱ء
۹	شہر تو راں	ایم۔ رفیق	۱۹۷۳ء
۱۰	وفا کی ڈور	روحی قاضی	۱۹۷۴ء
۱۱	بھنور	بشیر الدین ظامی	۱۹۷۵ء
۱۲	گم نام ہم سفر	ایس۔ کے۔ صغریٰ سبزواری	۱۹۷۶ء
۱۳	نئی زندگی	بشیر الدین ظامی	۱۹۷۸ء
۱۴	اعجاز مسیحا	نہال آڑھوی	۱۹۹۰ء
۱۵	خزاں کے بعد	رفیق ہارون	۱۹۹۴ء
۱۶	جہاں آرا	کبریٰ بیگم	۱۹۹۸ء
۱۷	پکار	مولانا سیّد محمد قاسم علوی	۲۰۰۱ء

۱۸	چارنک کی کشتی	صدیق عالم	۲۰۰۳ء
۱۹	رانگ نمبر	مشتاق انجم	۲۰۰۶ء

ادھراس موضوع پر ایک مضمون برادرم کلیم حاذق کا نظر سے گزرا، جس میں انہوں نے ''راہ کا کانٹا'' (شانتی رنجن بھٹاچاریہ) کو ناول قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دراصل اس قسم کی لغزش اصل متن کو نہ دیکھنے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ عمل تنقید وتحقیق کے لئے ضرر رساں اور گمراہ کن ہے۔

اس کے علاوہ چند ناول ایسے ہیں، جن میں سنین اشاعت نہیں ہیں، جیسے ثریا محمود ندرت کے تین ناول 'طوفان سے ساحل تک، 'غم کی چھاؤں میں' اور 'دکھ کے چھاؤں' سکھ کے پھوار'۔ ان تینوں ناول کو مشورہ بک نے شائع کیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول بھی ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہی لکھے گئے ہوں گے کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے مشورہ والوں نے پاکٹ بک کا سلسلہ ۱۹۶۰ء کے بعد ہی شروع کیا تھا۔

اب آیئے، مذکورہ ۱۹/ناولوں کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ مغربی بنگال میں ۱۹۶۰ء کے بعد جو ناول لکھے گئے ہیں، ان میں کتنے ناول مقتضائے وقت کا ساتھ دیتی ہیں اور اس عمل میں انہوں نے کس حد تک ناول کے فن کو برتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان ناولوں نے بدلتے ہوئے زمانے کا کس حد تک ساتھ دیا ہے۔ خواہ وہ سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کی صورت میں، یا ادبی تحریکوں کی شکل میں۔

سرلا

''سرلا'' ایک اہم معاشرتی اور رومانی ناول ہے، جسے بیگم مرزا احمد علی صاحبہ نے لکھا ہے۔ یہ ۲۳۷/صفحات پر مشتمل ہے اور جس کا ناشر عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ ہے۔ یہ بیگم مرزا احمد علی کا دوسرا ناول ہے۔ اس ناول کے سلسلے میں پروفیسر عباس علی خاں بیخود ایک صفحہ کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

> ''..... سرلا بھی رومانی ومعاشرتی ناول ہے اور اس قدر دلچسپ ہے کہ بغیر ختم کئے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ زبان نہایت شستہ اور ٹکسالی ہے اور کیوں نہ ہو آپ (بیگم مرزا احمد علی) کا تعلق کلکتہ کے ایک قدیم خاندان سے ہے جس نے علم وادب کی دنیا میں اپنا سکّہ بیٹھا دیا ہے۔ علاوہ بریں بابِ اوّل ہی سے پتہ چلتا ہے کہ موصوفہ نے اس کتاب کو ایک خاص جذبہ کے تحت ۱۹۴۷ء میں فسادات کے بعد لکھنا شروع کیا تھا جو وقت پر شائع نہ ہوسکی۔ اب بھی ایسے ناولوں کی ضرورت ہے، جن کا مقصد دو عظیم قوم کے مابین اتفاق واتحاد کو بڑھانا اور تنازعات کو ختم کرنا ہو۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب کامیاب ہوگی۔''

جیسا کہ دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناول ''رومانی ومعاشرتی'' ہے اور اس کا موضوع ملک کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے خوفناک فسادات سے پیدا شدہ حالات ہیں۔ ان حالات میں ناول نگار کا ''دو عظیم قوم کے مابین اتفاق واتحاد کو بڑھانا اور تنازعات کو ختم کرنا'' ہے۔

پلاٹ

ناول کا پلاٹ مختصراً یوں ہے کہ سرلا دیوی نام کی ایک حسین وجمیل لڑکی پہلگام (کشمیر) میں اپنے والدین دیوان کلیان داس اور ماں جمنا بائی کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ کمسنی میں بیوہ ہوگئی ہے۔ دیوان کلیان داس بیمار ہیں جس کی وجہ سے سرلا بہت پریشان ہے۔ اگر خدانخواستہ ان کا انتقال ہوگیا تو وہ بے سہارا ہوجائے گی۔ اس دوران دیوان کلیان داس کے دیرینہ دوست نواب صاحب کی اہلیہ کوکب بیگم اپنی بیٹی کوثر اور بیٹے ظفر کے ساتھ کشمیر کی سیر کیلئے آتی ہیں اور ایک ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوتی ہیں۔ ظفر، دیوان کلیان داس کے گھر اپنی والدہ اور بہن کے ہمراہ جاتا ہے تو وہاں سرلا دیوی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہ پہلی نظر میں ہی اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔ دونوں خاندان ایک دوسرے سے بہت گھل مل جاتے ہیں اور دونوں خاندان میں ایک طرح کی انسیت ہوجاتی ہے۔ اکثر ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ایک دن ظفر اظہار محبت کر دیتا ہے۔ لیکن اسے سرلا اپنی بیوگی اور غیر مذہب ہونے کی وجہ سے مثبت جواب نہیں دیتی ہے اور ہمیشہ کہتی ہے کہ میں ایک بھائی کی طرح چاہتی ہوں لیکن حقیقت میں وہ بھی دل سے اسے چاہنے لگتی ہے۔ اسی دوران دیوان کلیان داس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ سرلا اور اسکی ماں بالکل اکیلی ہوجاتی ہے۔ ایسے میں ظفر، اسکی ماں اور بہن نے پورا پورا ساتھ دیا۔ لیکن شراد کا جب وقت ہوتا ہے تو سرلا کا چچازاد بھائی کیلاش آدھمکتا ہے۔ اور شراد پر خرچ کرنے کیلئے مکان کو گروی رکھ دیتا ہے۔ دراصل وہ مکان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتا، کیونکہ سرلا اور اسکی ماں اسکی نیت بھانپ لیتی ہے اور مکان بیچ کر اور قرض چکا کر پورے ساز و سامان کے ساتھ اپنی بہن کے داماد رام کمار کے گھر، بریلی چلی جاتی ہے۔ وہاں رہ کر سرلا دیوی پھر پڑھائی شروع کرتی ہے اور وہیں اسکی ماں جمنا بائی کا انتقال ہوتا ہے

پھر وہ وہیں سے ڈگری کی پڑھائی کرنے انگلینڈ چلی جاتی ہے۔ادھر ظفرؔ بھی لکھنؤ لوٹ آتا ہے اور ادھر ظفر اپنی ماں کے اصرار پر ناہیدؔ نام کی ایک لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔لیکن اسکی ازدواجی زندگی بس واجبی سی رہتی ہے۔مجبوراً ناہید ہمیشہ اپنے میکے میں رہنے لگتی ہے۔اس طرح آٹھ سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔ظفر اپنے ایک دوست رشیدؔ کے ہمراہ الہ آباد جاتا ہے۔وہاں وہ رشید کے گھر والوں سے گھل مل جاتا ہے۔وہیں وہ ڈاکٹر شیریں کے بارے میں سنتا ہے۔اور جب دیکھتا ہے تو اسے ڈاکٹر شیریں بائی کے روپ میں سرلاؔ نظر آتی ہے۔شیریں بائی حقیقت میں سرلا ہی ہوتی ہے، جو انگلینڈ سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آ کر الہ آباد میں بس جاتی ہے اور خدمت خلق کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتی ہے۔لیکن پے بہ پے دکھوں نے اسکو دل کی مریضہ بنا دیا تھا۔جب ظفرؔ اسے دیکھتا ہے اس وقت وہ سخت بیمار رہتی ہے اور جب اسکے گھر اس سے ملنے جاتا ہے تو وہ بستر مرگ پر پڑی رہتی ہے۔ظفر کو دیکھ کر صرف ''ظفر بھائی'' ہی کہہ پاتی ہے اور اسکے بعد اسکی روح پرواز کر جاتی ہے۔ظفر یہ سہن نہیں کر پاتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے اور کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔

کردار

اس ناول میں بھی دوسرے ناولوں کی طرح تقریباً ۱۶ کردار ہیں، جو یوں ہیں :

۱۔ سرلا دیوی
۲۔ دیوان کلیان داس (سرلا کے والد)
۳۔ جمنا بائی (سرلا کی ماں)
۴۔ ظفر (نواب صاحب کا لڑکا)
۵۔ کوکب بیگم (نواب صاحب کی بیوی)
۶۔ کوثر بیگم (ظفر کی بہن)
۷۔ آشا (جمنا بائی کی بہن کی لڑکی)
۸۔ کیلاش (سرلا کا چچازاد بھائی)
۹۔ ناہید بیگم (ظفر کی بیوی)
۱۰۔ رشیدؔ، بیگم رشید اور محمود الحسن (ظفر کے دوست) رام کمار (آشا کا شوہر)
۱۱۔ ڈاکٹر شیریں بائی (سرلا کا دوسرا نام) اور دیگر ملازمین مثلاً منشی جی، مخلانی، مایا وغیرہ یہاں صرف دو کرداروں پر روشنی ڈالی جائے گی، جو اس کہانی کے ہیرو اور ہیروئن ہیں۔یعنی ظفر اور سرلاؔ۔

ظفر

ظفر لکھنؤ کے کسی نواب اور کوکب بیگم کا بیٹا ہے۔وہ لندن سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر آیا ہے اور ایک کامیاب بیرسٹر کی حیثیت سے شہر میں پہچانا جاتا ہے۔وہ اپنے والدین کا فرماں بردار بیٹا ہے اور اسکے اندر اعلیٰ اخلاقی اوصاف بھی ہیں۔وہ خصوصاً اپنی والدہ کوکب بیگم کو ہمیشہ راضی رکھنا چاہتا ہے اور کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتا جس سے اسکی ماں کا دل دکھے۔وہ اپنی ماں اور اپنی بہن کوثر بیگم کے ساتھ سیر کی غرض سے کشمیر جاتا ہے اور ایک ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہوتا ہے۔حالانکہ اس کے والد نواب صاحب جب کشمیر جاتے تھے تو دیوان کلیان داس کے گھر قیام کرتے تھے۔ویسے وہ وہاں پہنچ کر اپنی ماں اور بہن کے ہمراہ دیوان کلیان داس کے گھر ملنے جاتا ہے تو جہاں اسے دیوان صاحب کی ملاقات کی خبر ملتی ہے، وہیں اسکی ملاقات سرلا دیوی سے بھی ہوتی ہے جو کلیان داس کی اکلوتی بیٹی ہے اور جو کمسنی میں بیوہ ہو گئی ہے۔سرلا دیوی کے حسن و جمال دیکھ کر ظفر دل سے اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔لیکن اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا اور برابر دیوان کلیان داس کی عیادت کیلئے آتا رہتا ہے۔لیکن دیوان صاحب کی موت واقع ہو جاتی ہے۔دیوان صاحب کی موت سے سرلا بالکل ٹوٹ جاتی ہے اور سرلا کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی۔ظفر اسکے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے کرتے اپنے دل کی بات بھی زبان پر لے آتا ہے جسے سن کر سرلا بالکل مبہوت ہو جاتی ہے۔وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ان دونوں کا ملاپ کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔اسلئے وہ ظفر کو بہت سمجھاتی ہے اور پھر ظفرؔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ اپنی ناکام تمناؤں کے ساتھ چلا آتا ہے۔ظفر کی زندگی اپنی عدالتی مصرفیات میں الجھ جاتی ہے اور پھر کچھ دنوں بعد اپنی ماں کے اصرار پر ناہید بیگم سے شادی تو کر لیتا ہے لیکن ان دونوں کی ازدواجی زندگی برائے نام رہتی ہے۔ناہید بیگم زیادہ تر اپنے میکے میں رہتی اور وہ اکیلا اپنے گھر میں، جہاں اس کا گہرا دوست رشیدؔ کا ساتھ اسے میّسر تھا۔وہ تنہائی میں سرلا کی یاد سے گھرا رہتا ہے۔کیونکہ وہ اسے کسی طرح بھول نہ سکا تھا۔ایک دن جب وہ رشید کے ساتھ الہ آباد جاتا ہے اور وہ ایک تقریب میں سرلا کو دیکھ لیتا ہے لیکن اس وقت وہ سرلاؔ نہیں ڈاکٹر شیریں بائی کے نام سے جانی جاتی ہے۔اور جس وقت یہ راز کھلتا ہے کہ وہ حقیقت میں سرلاؔ ہی ہے، اس وقت سرلا اسکے سامنے ہی دم توڑ دیتی ہے، اور ظفر بھی بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ظفر کے کردار میں شرافت نفسی، فرماں برداری کے ساتھ ساتھ ایک ایسے مہذب انسان کی خصوصیت موجود ہے، جو اپنے دلی جذبات و احساسات کو اپنی والدہ کی خواہش پر بخوشی قربان کر دیتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے معاملے میں پُر جوش تو ہو جاتا ہے لیکن شرافت اور تہذیب کے دائرے میں ہی رہتا ہے۔ وہ اس وقت بھی شرافت کا مظاہرہ کرتا ہے جب سرلا کے چچازاد بھائی اسکے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ وہ کسی حال میں بھی اپنے خاندانی مرتبے اور پیشہ وارانہ حقیقت سے نیچے نہیں اترتا۔ پورے ناول میں اس کا کردار ایک سنجیدہ، باوقار اور مہذب شخص کا ہے۔

سرلا دیوی

سرلا دیوی کشمیر کے گلمرگ میں رہنے والے دیوان کلیان داس اور جمنا بائی کی اکلوتی لڑکی ہے۔ سرلا دیوی بچپن ہی میں بیوہ ہوگئی ہے اور اسکی زندگی اپنے والدین کے سہارے ہی گزر رہی ہے۔ اسکے والد دیوان کلیان داس صاحب فراش ہیں۔ بچنے کی اُمید کم ہی ہے۔ دیوان کلیان داس کے دوست نواب صاحب کی بیگم کوکب اپنی بیٹی کوثر بیگم اور ظفر کے ساتھ کشمیر سیر کی غرض سے آتی ہیں۔ ظفر، کلیان داس کے گھر ان سے ملنے آتا ہے۔ وہیں سرلا کی اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ ظفر سرلا دیوی پر فریفتہ ہو جاتا ہے لیکن سرلا جانتی ہے کہ ایک تو اسکی اجاڑ زندگی، دوسری مذہبی رکاوٹ کسی قیمت پر بھی ان دونوں کو ایک ہونے نہیں دے گی۔ اسلئے ہمیشہ وہ ''ظفر بھائی'' کہہ کر ہی مخاطب کرتی ہے۔ اس کے باوجود وہ ظفر کو بے انتہا چاہتی ہے۔ اسکی محبت میں جسمانی ملاپ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سرلا اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنا مکان بیچ کر اپنی والدہ کے ساتھ اپنے قریبی رشتہ دار کے گھر بریلی چلی جاتی ہے اور پھر اپنی والدہ کے انتقال کے بعد ڈاکٹری پڑھنے کے لیے لندن روانہ ہو جاتی ہے۔ جہاں سے آٹھ سال کے بعد لوٹتی ہے اور الہ آباد میں سکونت پذیر ہوتی ہے۔ لندن سے ڈگری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی تبدیل کر لیتی ہے اور اب وہ ڈاکٹر شیریں بائی ہے جس نے اپنی زندگی کا مقصد بیماروں کا دل و جان سے علاج کرنا بنا لیا ہے۔ لیکن وہ دل کی مریض بھی بن جاتی ہے اور دواؤں کے سہارے اپنی زندگی کی گاڑی کو ہانک رہی ہے۔ اتفاق سے الہ آباد میں مسز رشید کے گھر میں وہ ظفر کو دیکھ لیتی ہے۔ ظفر بھی اس کو پہچان لیتا ہے۔ وہ جب اپنا گھر لوٹتی ہے تو اس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے اور دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ ظفر بھی اسکے پیچھے آتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں اپنے روبرو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتی ہے اور اتنا ہی کہہ پاتی ہے ''ظفر بھائی'' اور اسکی روح پرواز کر جاتی ہے۔

سرلا دیوی انتہائی خوبصورت، باشعور، خوددار اور اپنی ذات کے کرب میں گم ہو جانے اور کسی پر اپنے دکھ کو نہ ظاہر کرنے والی لڑکی ہے۔ وہ محبت کا لطیف جذبہ تو رکھتی ہے لیکن اسکو جسمانی لذت سے آلودہ کرنا نہیں چاہتی ہے۔ وہ اپنے محبوب اور محبت پر خود کو قربان کر دینے پر ایمان رکھتی ہے اور آخر میں خود کو فنا کر بھی دیتی ہے۔ اس کا کردار جہاں اسکی خوبصورتی کی وجہ سے جاذب نظر ہے وہیں اسکی سنجیدگی، معاملہ فہمی اور سمجھداری کی وجہ سے پروقار بھی ہے۔

یہ ناول اپنے پلاٹ کے لحاظ سے تو نیم رومانی، معاشرتی ناول ہے اور اس میں کردار نگاری بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ اسکے باوجود پلاٹ کا صاف ستھرا ہونا اور ایک مخصوص طبقے اور اقدار کے افراد کی مذہبی تعصّب سے پاک زندگی کی عکاسی بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے کی گئی ہے۔ زبان و بیان میں حسن کے ساتھ اک خاص قسم کی چاشنی اور متانت ہے، جس نے ناول کو دلچسپ اور قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔

غرض، یہ ناول اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود ایک اچھی کوشش ہے۔

آخری شکست

۱۹۶۰ء میں شائع ہونے والے ناولوں میں ایک اور ناول، جسے ہم تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں ''آخری شکست'' ہے۔ جس کے مصنف جان عالم سیف ہیں۔ اس ناول میں ناول نگار نے اسپین کے مسلمانوں کے عروج و زوال کی دلدوز داستان بیان کی ہے۔ جان عالم سیف لکھتے ہیں:

> ''یہ ناول اس تابناک دور کی داستان پر مشتمل نہیں، جب طارق اعظم نے مٹھی بھر مسلمانوں کے ساتھ ساحل اسپین پر اُترنے کے بعد جہازوں کو نذرِ آتش کر دینے کا حکم دیتے ہوئے کہا تھا: 'اے لوگو! اب واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ سمندر ہمارے پیچھے اور دشمن ہمارے آگے۔ اب تو ہم اس جزیرہ پر فتح و ظفر کے پھریرے لہرائیں گے یا شہید ہو کر اسے اپنا ابدی مسکن بنالیں گے''..... یہ اُس وقت کی داستان ہے، جب اطراف عالم کے تہائی حصّے پر اپنے اقبال، جاہ و جلال کا پرچم نصب کرنے والوں کا

پرچم اسپین میں سرنگوں ہو چکا تھا۔ جب بیک وقت مشرق ومغرب کی وادیوں میں رہوار دوڑانے والے مجاہدوں کی اولاد پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنی عزت ووقار، حیرت وسالمیت کی آخری لڑائی لڑ رہی تھی۔''

ویسے یہ ناول اسپین میں مسلمانوں کے اقتدار کے بالکل آخری دور کی تاریخ ہے جسے ایک رومانی قصّے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ زوال غرناطہ کے بعد انگریزی فوج نے کس طرح مسلمانوں پر مظالم ڈھائے۔ اسپین میں اسلامی حکومت کے تابوت میں ابوعبداللہ کا دور حکومت آخری کیل ثابت ہوا۔ ذیل میں مختصراً ان تاریخی حقایق کو پیش کیا جارہا ہے تاکہ قاری ناول کے رومانی حصّہ سے صرف نظر کرکے تاریخی حقائق سے بہرہ ور ہو۔

۸۷۰ھ میں ابن اسمٰعیل کی وفات کے بعد اسکا بیٹا ابوالحسن تخت نشیں ہوا اور ۱۸۔۱۷ سال تک اسپین پر حکمرانی ہی نہیں کی بلکہ انگریزوں سے مسلسل لوہا لیتا رہا۔ ۸۸۷ھ میں وہ فرڈی ننڈ سے لوشہ کے مقام پر معرکہ آرائی کررہا تھا اور اسے شکست فاش دے کر میدان جنگ سے بھگا رہا تھا۔ ''ادھر غرناطہ میں سلطان کا بیٹا (ابوعبداللہ) اپنے باپ کے خلاف سازش میں مصروف تھا۔ سلطان ابوالحسن عیسائیوں کو کدھیڑ کر دور بھگانے اور اپنی سلطنت کو وسیع کرنے میں مصروف تھا کہ اسے یہ خبر ملی کہ ابوعبداللہ نے اطبریہ۔ بسط۔ اور غرناطہ پر قبضہ کرکے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا ہے۔'' اس طرح غرناطہ اور نصف مشرقی حصّہ میں ابوعبداللہ محمد کی حکومت ہوگئی اور مالقہ یعنی نصف مغربی حصّہ میں سلطان ابوالحسن کی حکومت باقی رہی۔ اس چھوٹی سی اسلامی حکومت کو دو حصّوں میں دیکھکر ایک طرف کے دہان حرص میں پانی بھر آیا۔ دوسری طرف باغی شہزادے ابوعبداللہ محمد نے سلطنت کا باقی نصف حصّہ بھی باپ سے چھین لینے کی تیاریاں کیں۔ چنانچہ اوّل۔ اشبیلیہ۔ استیجہ اور سریش کے عیسائی صوبہ داروں نے فوج فراہم کرکے سلطان ابوالحسن پر مالقہ میں حملہ کیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔''

سلطان ابوالحسن اس میں کامیاب تو ہوا لیکن اس کا بیٹا باپ کو مالقہ سے غائب پاکر اس پر حملہ آور ہوا اور قبضہ کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ بیٹے سے معرکہ آرائی ہوئی اور آخر کار باپ کو ختم نصیب ہوئی۔ بیٹا بھاگ کر غرناطہ کی طرف چلا گیا۔ سلطان ابوالحسن اس جنگ سے لوٹا تھا کہ اس پر فالج کا حملہ ہوا اور اسے دیکھنے کی طاقت جاتی رہی۔ ''ادھر عبداللہ محمد نے باپ کی طرف سے مطمئن ہوکر اور فوج فراہم کرکے عیسائیوں کے علاقہ پر حملہ کیا۔ مقام لوشہ میں پہنچ کر فوج کو تاخت وتاراج میں مصروف کردیا۔ وہاں کی عیسائی فوج کے سردار نے اس ناتجربہ کار مسلمان (سلطان) کو دھوکہ دیا اور دھوکہ دیکر چاروں طرف سے گھیر کر مسلمانوں کی فوج کو قتل کردیا اور عبداللہ کو گرفتار کیا اور گرفتاری کے بعد ابوعبداللہ محمد کو شاہ قسطلہ کے پاس بھیج دیا۔ یہ افسوسناک خبر سن کر غرناطہ کی رعایا نے جب ابوالحسن سے آمد کی درخواست کی تو وہ خود نہ آکر اپنے سلطان ابوعبداللہ زغل کو بھیج دیا اور گوشہ نشینی اختیار کی۔

سلطان ابوعبداللہ زغل نے ابھی ٹھیک سے عنان حکومت سنبھالی بھی نہ تھی کہ انگریزی سرداروں نے ان قلعوں پر اپنا قبضہ جمالیا، جو کمزور تھے۔ وہ اتنے باحوصلہ ہوگئے تھے کہ غرناطہ میں گھس کر مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنے لگے اور جب سلطان ابوعبداللہ زغل کو مسلمانوں میں خطرے میں پڑے دیکھا تو پلٹ کر وار کیا، اور ایسا رگیدا کہ انھیں بھاگتے ہی بنی۔ فردی نند جو اس موقع کو غنیمت جان کر حملہ کرنے آرہا تھا راستے میں ان سے ملاقات کے بعد اپنا ارادہ بدل دیا۔ لیکن اسلامی مقبوضات کو مختصر اور تنگ کرنے میں مصروف رہا۔

''فردی نند کو باوجود کامیابیوں کے اس بات کا یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کی حکومت کا استیصال کوئی آسان کام نہیں ہے..... فردی نند کی اس مآل اندیشی اور دانائی نے اس کو چند روز بلکتے جنگی سرگرمیوں سے روک دیا۔ اور اس نے فریب و دغا سے کام لینا مناسب سمجھا۔ اس کے پاس ابوعبداللہ محمد بن ابوالحسن جو جنگ نوشینہ میں گرفتار ہوکر آیا تھا موجود تھا۔''

فردی نند نے ابوعبداللہ محمد کو سلطان زغل کے خلاف ورغلانے اور اسے بے دخل کرنے میں جیسی بھی مدد کی ضرورت ہوگی، بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ ابوعبداللہ فردی نند سے رخصت ہوکر مالقہ آیا اور وہاں کے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور پھر ۸۹۱ھ میں ابوعبداللہ محمد اور سلطان زغل کو شکست دے کر کچھ حصّہ اپنے قبضے میں اور کچھ فردی نند کو دے دیا۔ اور پھر ۸۹۲ھ کو ابوعبداللہ محمد نے موقع پاکر غرناطہ پر قابض ہوگیا۔ ادھر فردی نند نے سلطان ابوعبداللہ زغل کو اپنا دوست بنانے اور غرناطہ کی حکومت دوبارہ دلوانے کا سبز باغ دکھایا زغل مجبوراً یا حقیقتاً اپنے رقیب ابوعبداللہ محمد کی تباہی دیکھنے کے شوق میں وادی آش فردی نند کے سپرد کرکے اُس کے ساتھ ہولیا..... زغل کے شریک ہونے سے فردی نند کا المیریہ پر باآسانی قبضہ ہوگیا۔ المیریہ اور وادی آش پر قبضہ ہونا گویا اندلس سے مسلمانوں کی حکومت کا نام ونشان ختم ہونا تھا۔ اب صرف شہر غرناطہ اور اس کے مختصر حالات مضافات ہی مسلمانوں کے قبضے میں رہ گئے۔ اس طرح فردی نند نے

اپنے عزم، استقلال اور حزم و احتیاط سے اندلس سے مسلمانوں کو ہمیشہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بڑی چالاکی سے ابوعبداللہ سے کچھ معاہدے کئے اور بعد مین ان معاہدوں سے پھر گیا۔ (اس معاہدے پر دستخط کی تاریخ ناول میں ۱۵ر نومبر ۱۴۹۱ء درج ہے جبکہ تاریخ اسلام از مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی ۳ر جنوری ۱۴۹۲ء ہے) اس معاہدے کی رو سے بقول ناول نگار :

''عیسائی نہ تو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں دخل دیں گے۔ ساجد اور مسلم اوقات محفوظ رہیں گے۔ مسلمانوں کے معاملات شرع اسلامی کے مطابق مسلمان قاضی طے کریں گے۔ طرفین کی قیدی رہا کر دئے جائیں گے۔ جو مسلمان اسپین (شہر غرناطہ) میں رہنا چاہیں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ جو مسلمان افریقہ ہجرت کرنا چاہیں حکومت ان کے لئے جہاز کا انتظام کر دے گی۔ مسلمانوں سے تین سال تک کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کوئی زاید ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا۔ ساٹھ دن کے اندر اندر شہر غرناطہ' قلع الحمرا' توپ خانہ اور تمام سامان جنگ پر عیسائیوں کا قبضہ کرا دیا جائے۔ سلطان ابوعبداللہ کے سپرد البشراۃ حکومت کر دی جائے۔''

یہی وجہ ہے کہ ساٹھ روز پورے ہونے سے پہلے ہی یعنی ۱۲ر ربیع الاول ۸۹۸ھ کو قصر الحمراء عیسائیوں کے سپرد کر دیا۔ فردی نند نے اندلس کے بڑے پادری منذورہ کو حکم دیا کہ وہ مع فوج پہلے شہر میں داخل ہو اور قلع الحمرا کے سب سے بلند برج پر سے اسلامی نشان کو گرا کر صلیب نصب کر دے۔ ''مسلمانوں نے اس حالت میں شہروں اور میدانوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لی اور ہر قسم کی اذیت برداشت کی۔ جہاں پایا وہیں قتل کر دیا گیا اور جلا دیا گیا۔ ہر طرح سے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔''

''بعض مسلمانوں پر عیسائیوں نے بظاہر یہ سب کے بڑی مہربانی کی کہ ان کو افریقہ چلے جانے کی اجازت دی۔ ان لوگوں کے لئے جہاز بھی فراہم کر دئے۔ انھوں نے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جو سب سے زیادہ قیمتی سامان جہازوں میں لادا تھا۔ وہ نایاب اور قیمتی کتابوں کے دفاتی تھے۔ مگر عیسائیوں نے ان جہازوں کو ساحل افریقہ تک پہنچنے سے پہلے سمندر کے اندر غرق کر دیا۔'' اور کہا جاتا ہے کہ جس دن یہ دلدوز واقعہ رونما ہوا تھا اس دن یکم اپریل تھا اور اسی کی یاد میں ''اپریل فول'' منایا جاتا ہے۔ یعنی کس طرح عیسائیوں نے مسلمانوں کو بے وقوف بنایا تھا۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا ہے کہ ''عیسائیوں نے الحمراء پر قابض ہو کر معاہدے کی تمام شرائط کو فوراً فراموش کر دیا۔ شہر غرناطہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان ابوعبداللہ کو البشرات میں نہیں رہنے دیا۔ بلکہ انھوں نے تھوڑے سے روپئے دیکر البشرات کو بھی ابوعبداللہ سے خرید لیا۔'' (ناول کے مصنف نے اس واقعہ کے بیان میں ابوعبداللہ کے ہاتھوں البشرات کے بیچے جانے کا واقعہ حذف کر دیا ہے) خیر وہاں سے ابوعبداللہ مراقش سے جا کر شاہ مراقش کا نوکر ہو گیا۔ وہاں ایک عرصہ دراز تک اس حالت میں رہ کر فوت ہوا۔

ظاہر ہے ''آخری شکست'' اسپین میں مسلمانوں کی آخری کوشش بقا کی روداد ہے۔ جان عالم سیف کا کمال یہ ہے کہ اتنی کمسنی میں انھوں نے اس قدر پُر اثر اور جوش سے بھرا ہوا ناول لکھا۔ تاریخی ناول میں واقعات کی نیرنگی تو نہیں ہوتی ہے' تاریخ کے اوراق پارینہ ہوتے ہیں۔ اس لئے مصنف کو بیانیہ اور مکالمے کے سہارے ہی واقعات کو بڑھانا پڑتا ہے اور وہ اندازِ تحریر اپنانا پڑتا ہے تاکہ قاری کی دلچسپی برقرار رہے اور وہ منظر کشی کرنی پڑتی ہے کہ قاری کے سامنے گزشتہ ادوار کی تصویر اُبھر آئے۔ اس لحاظ سے جان عالم سیف یقیناً کامیاب ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اقتباس دیکھئے کس قدر کامیاب منظر نگاری ہے :

''شاہ فلپ کبر و غرور کا مجسم بنا تخت سلطنت پر جلوہ افروز تھا' شاہی خاندان کے افراد، درباری امرا' سپہ سالار' وزیر اعظم اور دوسرے اراکین سلطنت اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اردگرد سپاہی زرق برق وردیوں میں ملبوس تلوار کھینچے اور نیزے علم کئے ہوئے کھڑے تھے۔ دربار ریشمی کپڑوں سے آراستہ تھا۔ قیمتی جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے۔ غرضکہ ایوان دربار کو ہر طرح سے سجایا گیا تھا۔ درباری رقاصائیں اپنے رقص کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور حسین و جمیل ساقیان مئے کے جام بھر بھر کر دے رہی تھیں۔ میٹھے سُروں میں ساز کی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ فلپ اور اس کے درباری جام لے کے لچار ہے تھے کہ اچانک چوبدار کی آواز سنائی دی۔ ''قیدی حاضر ہیں۔''

پھول بنے انگارے

''پھول بنے انگارے'' سجاد نظر کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ 18 mm سائز کے ۱۳۴ صفحات کا یہ ایک خالص رومانی ناول ہے۔ بقول راشد سہسرامی 'پھول بنے انگارے' کی کہانی :

''ایک ایسے نوجوان کے گرد گھومتی ہے جو طبعاً ایماندار اور مخلص ہے۔ اتفاقاً تین عورتیں اسکی زندگی پر چھا جاتی ہیں ایک اس کی شریک حیات ہے، دوسری عورت بے حد مظلوم ہے اور سماج کے بے جا قید کا ہدف بن کر اپنی زندگی کو روگ لگا لیتی ہے اسکی زندگی ایک مکمل المیہ ہے۔ ہیرو کو اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے جو بتدریج محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تیسری عورت جو ایک نوشگفتہ پھول ہے، عجیب و غریب حالات میں ہیرو کی زندگی پر چھا جاتی ہے۔ ہیرو اس سے محبت نہ کرنے کے باوجود اسکے ساتھ اپنی زندگی کو ملوث کر لیتا ہے۔ وہ اس سے کسی وقت بھی محبت نہیں کرتا لیکن اسکے چکر میں کچھ اس طرح پھنستا ہے کہ وہ گردو پیش سے غافل نہ ہونے کے باوجود اپنی ذمہ داریوں کو نباہنے کے قابل نہیں رہتا۔ تیسری عورت سے جذباتی وابستگی اور پچھلی دو عورتوں سے متعلق اپنے فرائض کا احساس، یہ چیزیں اسے خوفناک ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھتی ہیں۔ بالآخر اس کی قوت ارادی فنا ہو جاتی ہے اور غنودگی کی کیفیت اس پر ہر وقت طاری رہتی ہے۔''

راشد سہسرامی مزید لکھتے ہیں :

''اگر چہ اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی ہیرو کی ذہنی کشمکش ہے۔ لیکن دوسری چیزیں کسی بھی حالت میں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں ۔کہانی کی بناوٹ' کردار نگاری' منظر کشی اور اس قسم کی بہت سی چیزوں نے ناول کو بے حد دلچسپ اور پر کیف بنا دیا ہے۔ کہانی کا ماحول کچھ اس قسم کا ہے کہ پڑھنے والا کچھ عرصہ کیلئے اس میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔''

ان دونوں آرائیں بہت کچھ صداقت ہے، تو کچھ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ راشد صاحب نے' چونکہ مقدمہ لکھا ہے، اور مقدمہ یا پیش لفظ وغیرہ لکھنے کے آداب اور تہذیب ہی ہے کہ کتاب اور صاحبِ کتاب کی توصیف کی جائے۔ تا کہ قاری کو کتاب پڑھنے پر راغب کیا جائے۔ گویا ایک قسم کی ادبی سیلس مین شپ ہے۔ خیر، اس ناول کے تجزباتی مطالعہ کرنے سے قبل یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ ناول نگار نے جب یہ ناول لکھا تھا اس وقت وہ کالج کا ایک نوعمر طالب علم تھا۔ اس لئے اسے اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

ابتداء میں جو آرا فاضل مقدمہ نگار کی نقل کی گئی ہیں۔ وہ ایک تمہیدی اور تاثراتی ہیں۔ اور کچھ حد تک کہانی کا پلاٹ بھی پیش کیا گیا۔ لیکن انھوں نے کردار وں کے نام نہیں لکھے۔ دراصل یہ کہانی ایک ایسے شادی شدہ نوجوان (جس کا نام پورے ناول میں کہیں نہیں ہے) کے رومانس کی ہے، جو سراپا رومان پرور ہے اور عورت اسکی کمزوری۔ جو اسے بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کی طرح راغب کرتی ہے۔ اسکی بیوی شیاما ہے' جو وفا شعار ہے اور ہر طرح شوہر کا خیال اور اسکی دلجوئی کرتی ہے۔ اسلئے کہ شیاما اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ اس کے باوجود کامنی جو ایک شادی شدہ عورت ہے اور اپنے ظالم شوہر کی وجہ سے تپ دق کی مریضہ ہو جاتی ہے۔ کہانی کا ہیرو ''وہ'' اس سے بھی ہمدردی کرنے لگتا ہے جو آگے چل کر محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ''وہ'' یعنی کہانی کا ہیرو چاہتا ہے کہ کامنی کسی طرح اس مہلک مرض سے نجات پا جائے۔ اور اس کے لئے وہ اسے نینی تال کے سینی ٹوریم میں لے جاتا ہے۔ کامنی کے گھر اسکی ملاقات اسکی سوتیلی بیٹی سپنا سے ہوتی ہے جو حسن و شباب کی دیوی ہے۔ وہ اسکی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ان کے مراسم اتنے بڑھتے ہیں کہ سپنا حاملہ ہو جاتی ہے اور جب یہ اطلاع سپنا اسے دیتی ہے تو وہ چاہتا کہ اس کے بچہ کا وجود اسقاط کے ذریعہ مٹا دے۔ جس سے سپنا کافی برہم ہوتی ہے اور اس سے شادی کا مطالبہ کرتی ہے جسے وہ ٹھکرا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا ہے اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ہے۔ آخر اچانک ایک دن سپنا کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی۔ ادھر شیاما کو کامنی اور سپنا کے خطوط ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ جن سے وہ اتنی دل برداشتہ ہوتی ہے کہ مر بھی جاتی ہے۔ اُدھر کامنی سینی ٹوریم میں زندہ ہے یا مُردہ' کچھ پتہ نہیں لیکن معلوم پڑتا ہے کہ وہ ہیرو کے انتظار میں تھی۔

ناول کا کردار ''وہ'' تین مختلف عورتوں کی زندگی سے جڑے ہونے کے باوجود وہ کسی کے ساتھ وفاداری نہیں کرتا۔ حالانکہ تینوں عورتیں، شیاما، کامنی اور

سپنا اسے دل سے چاہتی ہیں (یہاں ناول نگار نے ''ہیروازم'' کا مظاہرہ کیا ہے)۔اور یہی اس کہانی اور ناول نگاری دونوں کا المیہ ہے۔

اس ناول میں ناول نگار نے یادوں اور فیلش بیک کی تکنیک کے سہارے کہانی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔لیکن ناول میں زمان ومکاں کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ہاں، کہیں کہیں خوبصورت منظر کشی ضرور ملتی ہے۔

شاید ناول نگار کے پیش نظر محاکات سے زیادہ جذباتی احساس کا رومان انگریز بیان رہا ہو اور وہ یہ چاہتا ہو کہ خوبصورت اور تراشے ہوئے جملوں اور مکالموں کے سحر میں قاری کو الجھا کر داد وتحسین حاصل کرے۔اس عمل سے ناول پڑھتے وقت دلچسپی تو ضرور ملتی ہے، لیکن فکر کو مہمیز نہیں لگتا۔کہانی کی زبان بہت پیاری اور پُر اثر ہے اور جو مکالمے اس ناول میں کردار 'وہ' یا راوی یا دوسرے کرداروں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں وہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہیں۔ذیل میں چند نمونے دیکھئے :

> ''انسان کا وجود سپنوں کے سنہری ذروں سے جوڑ جوڑ کر بنایا گیا ہے اور اسی لئے وہ ہار کر بھی یہی سوچتا ہے کہ ایک دن وہ جیت جائے گا۔''
>
> ''یہاں کون مسرت کا خواہش مند نہیں' یہاں کی محبت کی تلاشی نہیں۔لیکن کون کامیاب ہوسکا۔یہ سڑکوں پر ہنستے ہوئے جوڑے ۔یہ کھڑکیوں پر مسکراتے ہوئے چہرے، یہ سنیما ہالوں میں ہنس ہنس کر محبت کرنے والے۔یہ چاندنی راتوں میں مہکی مہکی سانسوں سے عہد وپیماں کرنے والے۔کتنا بھیانک ہے ان کا انجام۔کاش انہیں بتا سکتا، انہیں سمجھا سکتا۔کتنے پیارے ہیں یہ سپنے لیکن کتنی ہولناک ہیں ان کی تعبیریں۔''
>
> ''اف! کتنی کھنکھناہٹ تھی اس کی آواز میں۔جیسے چکنے فرش پر کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔''
>
> ''اس کے سینے میں پھر ایک بار بھٹی سلگ اٹھی اور وہ سپنا کو لپٹائے جلتا رہا اور پھر دھیرے دھیرے شیاما کی محبت جل گئی' کامنی کا پیار جل گیا اور اسکے دل کے اندر کا دیوتا جل گیا۔''
>
> ''عورت' زندگی سے بھی سخت معمہ ہے۔''

ان اقتباسات سے یہ بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ناول نگار کو زبان وبیان پر کیسی قدرت ہے، باوجود کہ وہ ایک نوعمر طالب ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر teanage رومانس کی کیفیت ملتی ہے۔جس سے ناول میں سطحی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔جسکی وجہ سے ناول کی کہانی عصری تقاضوں، مثلاً معاشی حالات' سماجی زندگی کے تقاضے اور سیاست ان سے مبرا ہو کر صرف عورت اور رومانس کے گرد گھومتی ہے۔اگر ان بنیادی حقیقتوں کو اس رومانس سے ہم آہنگ کیا جاتا تو شاید ایک اہم ناول قرار پا سکتا تھا۔

روپ متی

روپ متی جان عالم سیف کا دوسرا تاریخی ناول ہے۔اس کا ماحول ہمایوں کا دورِ آخری اور اکبر کی تاجپوشی کے ابتدائی برسوں اور سقوط مالوہ تک محدود ہے۔اس ناول کا پس منظر تاریخ مالوہ ہے۔مالوہ کے سلطان شجاع خان کے انتقال کے بعد جب اس کا بڑا بیٹا بایزید خاں نے، جو باز بہادر کے نام سے مشہور ہے، انتظام حکومت سنبھالا، تو اس کی نظر انتخاب روپ متی پر پڑی اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔اور کچھ رکاوٹ کے باوجود وہ اس کے نکاح میں آجاتی ہے۔روپ متی ظاہری حسن کے علاوہ' اچھی شاعرہ بھی تھی اور باز بہادر موسیقی کا دلدادہ اور فن کا ماہر تھا۔اس ناول کے متعلق صرف آغاز میں مصنف خود لکھتے ہیں:

> ''..... تاریخ کے صفحات پر راہ وفا کے شہیدوں کی جتنی داستانیں نقش ہیں ان میں ایک مالوہ کی غم نصیب ملکہ روپ متی کی داستان بھی ہے، جو مدتیں گزرنے کے بعد بھی ہمارے دلوں پر گہرا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔وہ چمن زار محبت کا ایک حسین پھول، سنگیت کی دنیا کی ایک خوش نوا راگنی' ایک شہزادہ کے حسین خواب کی حسین تعبیر تھی، جسے اس کی تقدیس، اس کی عظمت، اس کی وفا، اس کی محبت اور اس کے سنگیت نے تاریخ میں غیر فانی بنا دیا۔''

تاریخ کی یہ غیر فانی داستان کچھ یوں ہے کہ بایزید خان (باز بہادر) کو عالم شہزادگی میں ہی خواب میں ایک حسین دوشیزہ نظر آتی ہے۔جس کے حسن کی ہم پلّا محل کی کنیزوں میں کوئی نہیں۔ برسوں بعد جب وہ اپنے والد شجاع خان کے انتقال کے بعد انتظام حکومت سنبھالا تو ایک دن دورانِ شکار وہ ایک ہرن کے پیچھے اکیلے بھاگتا ہوا ندی کے کنارے پہنچا جہاں اس نے روپ متی کو غسل کرتے دیکھا اور پہلی نظر میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ کیونکہ جس خوبصورت اور حسین دوشیزہ کو وہ خواب میں دیکھا کرتا تھا وہ ہو بہو وہی تھی۔ حاکم وقت کی نظر انتخاب نے روپ متی کو محل میں بحیثیت شریک حیات پہنچا دیا۔ دونوں اپنی زندگی کے دن بحسن وخوبی گزارنے لگے۔ مانڈو کے شاہی محلات ان دونوں کے گیت اور سنگیت سے گونجنے لگے تھے۔ حکومت کے کاروبار نائبین چلا رہے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ حکومت میں کمزوری آنا تھی اور اکبر نے موقع دیکھ کر اسے اپنے قلمرو میں شامل کرنے کے ارادے سے حملہ کر دیا۔ باز بہادر نے مقابلہ تو کیا لیکن اپنے چھوٹے بھائی مصطفٰے خان اور منہ بولے بھائی دولت خان کی غداری کی وجہ سے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور میدان جنگ ہی میں اسکی موت واقع ہو گئی۔ باز بہادر کی موت کے بعد ادہم خان روپ متی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن روپ متی نے اپنی جان دے کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا، اور آج تک مالوہ کے لوگوں کے دلوں میں ان دونوں کی لافانی محبت کی داستان محفوظ ہے۔ بقول مصنف :

''مانڈو کے نیم شکستہ شاہی محلات کو دیکھکر آج بھی حسّاس دلوں میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حرماں نصیب روپ متی کی روح صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے۔''

اس تاریخی واقعے کو جان عالم سیف نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے تاریخی ناول کے روپ میں ڈھالا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان کی کامیابی دراصل ان کے اسلوب اور انداز بیاں کی وجہ سے ہے۔ ساتھ ہی وہ تاریخ و رومان کو اسطرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ دونوں شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔

ان کی اس کتاب کے سلسلے میں طبیب صاحب کی رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

''.....سیف کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کہانی لکھتے وقت جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے۔ تاریخ اور رومان کا سنگم جہاں ہوتا ہے وہاں اچھے اچھے مصنفوں کا قلم بھی بہک جاتا ہے۔ کرداروں سے یا تو انتہائی جذباتی وابستگی ہو جاتی ہے یا ان کے متعلق مصنف کے دماغ میں پہلے ہی نیک خیالات نہیں ہوتے اور یہ باتیں کتاب میں بھی لاشعوری طور پر آ ہی جاتی ہیں۔ لیکن جانِ عالم سیف میں یہ خامی نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے تاریخ اور رومان کا اتنا حسین امتزاج اپنی کتاب میں کیا ہے کہ پڑھتے جایئے اور طبعیت کہیں نہیں بھٹکتی۔ تاریخ کے واقعات بھی توڑ مروڑ کر نہیں پیش کئے گئے ہیں۔ اور نہ ہی ان کے کردار انگریزی کی اصطلاح میں ''لکڑی کے کردار'' معلوم ہوتے ہیں۔''

طبیب صاحب کی اس جامع اور خوبصورت رائے کے بعد میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جان عالم سیف کو اس بات کا بھی امتیاز حاصل ہے کہ وہ بنگال کے واحد تاریخی ناول نگار ہیں۔

پیاسے دل

یہ ایک رومانی ناول ہے، جس میں ایک آرٹسٹ اور ایک امیر زادی کے عشق کو بڑے ہی پُر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ یہ ہے کہ ہیرو یعنی آرٹسٹ، جس کا نام شانتی کمار ہے اور جو ایک ریٹائرڈ جج، بدری ناتھ کی اکلوتی بیٹی (سرتا) سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ سرتا بھی آرٹسٹ کی محبت میں بالکل پاگل ہے اور چاہتی ہے کہ اس سے شادی کر لے۔ لیکن بدری ناتھ کو یہ رشتہ کسی طرح پسند نہیں۔ لہذا اس نے بیٹی کو شانتی کمار سے دور کرنے کیلئے شانتی کمار کی موت کی جھوٹی خبر پھیلا دیتا ہے اور سرتا بڑی معصومیت سے اس خبر پر یقین بھی کر لیتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ سخت بیمار پڑ جاتی ہے۔ اس کے علاج کیلئے بدری ناتھ ڈاکٹر سہگل کا انتخاب کرتا ہے۔ ڈاکٹر سہگل کے علاج سے وہ شفایاب ہو جاتی ہے تو بدری ناتھ چاہتا ہے کہ ڈاکٹر سہگل سے اپنی بیٹی کی شادی کر دے۔ سرتا اس تجویز کی سخت مخالفت کرتی ہے۔ آخر ہار مان کر تیار ہو جاتی ہے لیکن حجلۂ عروسی میں اسکی موت واقع ہو جاتی ہے۔

اِدھر شانتی کمار سرتا کا بہت انتظار کرتا ہے اور اس کے بغیر اسکی ناتمام تصویر پڑی رہتی ہے کہ اچانک اسکی ملاقات نندہ سے ہوتی ہے جو سرتا کی بالکل ہم شکل ہے۔ وہ اس سے بے اختیار لپٹ جاتا ہے اور شکوہ سنج ہوتا ہے کہ سرتا اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی۔ نندہ جو ایک دوسرے شہر میں اسکول ٹیچر، حالات کی

نزاکت کو اچھی طرح سمجھ کر خاموش رہتی ہے اسکی تصویر کو مکمل کرنے میں ساتھ دیتی ہے۔ جلد ہی ٹاؤن ہال میں تصویری مقابلہ ہونے جا رہا تھا، جس میں اسکی تصویر کو شامل ہونا تھا۔ نندؔہ کو امید تھی کہ پہلا انعام شانتی کمار ہی کو ملے گا۔

آخر وہ وقت بھی آ جاتا ہے۔ ٹاؤن ہال میں چاروں طرف تصویروں کی نمائش ہو رہی ہے اور تھوڑی دیر میں ججوں کے فیصلے آنے والے ہیں۔ نندؔہ، شانتی کمار کے ساتھ ساتھ ہے۔ جب پہلا انعام پانے والے کے نام کا اعلان ہوتا ہے، نندؔہ بہت خوش ہوتی ہے کیونکہ شانتی کمار ہی کو اس انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ چاروں طرف سے اسے داد و تحسین ملتی ہے اور اخباری رپورٹر اسکو گھیر لیتے ہیں۔ وہ جب ان سے فارغ ہوتا ہے تو نندؔہ جسے وہ سریتا سمجھتا ہے، کہیں نظر نہیں آتی ہے۔ وہ آخر تک انتظار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام لوگ چلے جاتے ہیں۔ وہ گھر پہنچا تو اسے نندؔہ کا خط ملا جس میں اس نے تفصیل سے تمام باتیں بتائیں کہ وہ سریتا نہیں، نندہ ہے۔ اس خط کا اس پر اسقدر اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے :

> ''صبح کے تمام اخباروں میں شانتی کمار کی شاہکار تصویر جسے نمائش میں پہلا انعام ملا تھا، صفحۂ اوّل پر شائع ہوئی تھی۔ بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ اس کے فن کو سراہا گیا تھا۔ اس کے آرٹ کی تعریفیں کی گئی تھیں۔ اور اسی اشاعت میں دیر رسیدہ خبروں کا کالم میں یہ خبر چھپی تھی.....گذشتہ شب کے آخری پہروں میں کسی غیر معمولی دلی صدمہ سے ملک کا سب سے بڑا اکلاکار شانتی کمار اچانک پاگل ہو گیا۔''

مذکورہ جملوں پر ہی کہانی کا اختتام ہوتا ہے۔ ابراہیم اختر کے یہاں کہانی کے تانے بانے بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ ان کے اس ناول کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ مسلسل لکھتے رہتے تو اردو ناول نگاری میں ان کی پہچان بن سکتی تھی۔

ناول نگار کی زبان بہت سادہ، صاف اور سلیس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں اور مکالموں کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھانے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

وائسرائے کپ

وائسرائے کپ ممتاز اور کہنہ مشق شاعر ابوالبیان مائل لکھنوی کا اکلوتا ناول ہے، جو کلکتہ کے پس منظر میں ہے۔ اس ناول کا پلاٹ یوں ہے کہ کلکتہ شہر کے مشہور اور ہر دلعزیز رئیس عبدالرحیم صاحب نے مرتے وقت اپنے اکلوتے بیٹے نسیم کو تین نصیحتیں کی تھیں کہ ''تعلیم جاری رکھنا' جوا کبھی نہ کھیلنا اور شراب سے بچنا۔''

شروع میں تو نسیم ان تینوں نصیحتوں پر عمل پیرا رہا لیکن کچھ دنوں کے بعد اپنے ۱۲ خاص دوستوں کے چکر میں پڑ کر ان نصیحتوں کو بھول بیٹھا اور کالج چھوڑ کر' ہر ہفتے ریس کورس جانا اور ہر شام محفل طرب جمانا شروع کر دیا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی اور پھر ان مشاغل کے ساتھ کوٹھے پر مس کجن پر پیسے برباد کرنا اور ایک فلمی اداکارہ مس ممتاز کے عشق میں گرفتار ہونا بھی شامل تھا۔ ریس کے خاص Event وائسرائے کپ میں اچھی خاصی رقم ہار جانے کے بعد نسیم مالی طور پر بالکل قلاش اور قرض دار ہو جاتا ہے اور ممبئی چلا جاتا ہے تاکہ مس ممتاز کا دیدار کر سکے اور وہاں کوئی کام کر سکے۔ گاڑی چلانی آتی تھی۔ اس لئے ایک سیٹھ کے یہاں ملازم ہو گیا۔ اتفاقاً وہ سیٹھ مس ممتاز سے اپنی ہوس پوری کرنا چاہتا تھا لیکن ناکام ہونے کی صورت میں وہ خود مس ممتاز کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نسیم اس پستول سے گولی چپکے سے نکال لیتا ہے اور جب سیٹھ مس ممتاز پر حملہ آور ہوتا ہے تو اسے ناکامی ہوتی ہے جب مس ممتاز کو معلوم ہوتا ہے کہ نسیم کی وجہ سے اسکی جان بچی ہے تو وہ فلم میں اداکاری کیلئے سفارش کرتی ہے اور اسے کام مل جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں قریب ہوتے ہیں۔ لیکن مس ممتاز، نسیم سے شادی کرنا نہیں چاہتی ہے۔ اس دوران ایک فلم بنتی ہے جس میں دونوں ہیرو اور ہیروئن کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ کہانی نسیم اور ممتاز کی آپ بیتی لگتی ہے۔ آخری میں یہ دکھانا تھا کہ ہیرو جب دیکھتا ہے کہ ہیروئن اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی ہے تو خود کو گولی مار کر مر جاتا ہے لیکن نسیم اس سے نقلی پستول کی بجائے اصلی پستول لیکر کام کرتا ہے۔

ناول کا آخری منظر یوں ہے :

> ''نسیم : میں آج آخری بار اور بالکل آخری بار تمہیں پھر یقین دلاتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس کے بعد میرا لب شکوہ بند اور دھڑکتا ہوا دل ہمیشہ کیلئے نہیں تو قیامت تک کیلئے خاموش ہو کر دنیا کے لئے ایک 'عبرت تاریخ محبت

چھوڑ جائے گا۔''

مس ممتاز: (انداز سے)

''یہ کہہ کر تم مجھے اپنے مرنے سے ڈراتے ہو۔ کیا میں اس سے ڈر جاؤں گی؟ یاد رکھو عورت کا دل جتنا موم ہے اتنا ہی پتھر۔''

اتنا کہہ کر بے رخی کی ادا سے اس نے چلنے کا قصد کیا اور نسیم، جس نے آج فرضی تماشے کو اصلی کر دکھانے کی ٹھان لی تھی، جیب سے خالی پستول کے عوض بھرا ہوا پستول نکالا اور ڈرامہ کی عبارت (مکالمہ) کے خلاف ہیروئن کا نام نہ لے کر اس نے کہا :

''ممتاز! خدا حافظ۔''

اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپکو نشانہ بنا کر نہ صرف تماشہ بلکہ اپنی زندگی کا تماشہ بھی ختم کر دیا۔

اس ناول کی دو اہم خوبیاں ہیں۔ ایک اس کی زبان، جس کا نمونہ آپ خود اوپر کے جملوں میں دیکھ لیجئے۔ دوسرے، اس میں نسیم کے دوستوں کو نام دینے کے بجائے نمبر دیئے گئے ہیں۔ نسیم کے بارہ دوستوں کے ترتیب وار نمبر ہیں۔

ویسے یہ ناول جس مقصد کیلئے لکھا گیا ہے، وہ بہت صالح اور نیک ہے۔ دولت کی فراوانی اور سرپرستی کا فقدان نوجوانوں کو اسی طرح کی ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

خواب بیداری

۱۹۶۰ء کی دہائی کا ایک اور اہم ناول ''خواب بیداری'' ہے جس کی مصنفہ ایس۔ کے۔ صغریٰ سبزواری ہیں۔ یہ ناول ۱۹۶ صفحات پر محیط ہے۔ شروع کے دس صفحات تعارف کے طور پر رضا مظہری نے لکھے ہیں' جن میں انھوں نے سرسری طور پر خواتین ناول نگاروں کا جائزہ لیا ہے اور ان کے درمیان صغریٰ سبزواری کا مقام بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''محترمہ صغریٰ سبزواری کا یہ ناول بھی سماجی ہے۔ قصّہ کے پلاٹ اور تکنیک کے لحاظ سے ناقدین کو اس ناول میں خامیوں بھی نظر آئیں گی مگر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ محترمہ نے جو محسوس کیا ہے' وہ لکھا ہے۔ زبان خاصی سلیس اور با محاورہ ہے' مکالمے بھی جاندار ہیں اور کردار کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ کردار نئے نہیں۔ ہمارے معاشرے میں قدم قدم پر ماسٹر صاحب جیسے سادہ لوح اور کمزور دل باپ، سیّما کی ماں جیسی بے عقل مائیں اور وسیم (فہیم) جیسے جلاّد چچا اور سیّما جیسی حالات کی ماری لڑکیاں ملتی ہیں۔ مسلمانوں کا متوسط طبقہ آج کل جن پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے اور جو تعصّبات اور توہمات اسے آج بھی دبوچے ہوئے ہیں' ان ہی دُکھتی رگوں پر بیگم سبزواری نے بھی اُنگلی رکھی ہے۔''

لیکن مصنفہ خود اپنے ناول کے بارے میں کیا فرماتی ہیں، دیکھئے :

> ''زیر نظر ناول میں نے اک بنگلہ ناول کے مطالعہ کے زیر اثر تصنیف کیا ہے جسے میری نظر سے گذرے عرصہ ہوا۔ اس کتاب نے میرے دل و دماغ پر وہی اثر کیا تھا جو کہ ایک شفیق و دانا استاد کی نصیحتیں کرتی ہیں۔ چنانچہ انہیں تاثرات کو میں نے اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھالا اور آج جو کچھ بھی قارئین کرام کے پیش نظر ہے یہ میری پہلی کاوش کا نتیجہ ہے' گو افسانہ نگاری کو تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا لیکن ناول نگاری کا یہ پہلا اتفاق ہے۔''

مصنفہ کے اس بیان سے ایک بات تو سامنے آتی ہے کہ وہ سچی فنکار ہیں۔ کیونکہ اگر وہ مذکورہ اعتراف نہ کرتیں تو شاید ہی کسی کو یہ اندازہ ہوتا کہ یہ کسی بنگلہ ناول سے اخذ شدہ ہے۔ چونکہ ان کا یہ پہلا ناول ہے اسلئے ناول کے مروجہ معیار پر ممکن ہے، پورا نہ اترتا ہو۔ لیکن یہ اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ ان کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے۔ آج تو یہ عالم ہے کہ لوگ اپنے تحقیقی مقالے اردو کے ہی دس' بیس سال قبل شائع ہونے والی کتب یا مضامین کو بغیر حوالے کے اپنا کر پیش کرتے ہیں، یا انگریزی زبان کی دو چار دس کتابوں کو سامنے رکھ کر اس کا آزاد ترجمہ یا اخذ کر کے اپنی معرکتہ الآرا کتاب تصنیف کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

بہر کیف، ناول کا پلاٹ کچھ یوں ہے :

پلاٹ

اس ناول کا پلاٹ سماج میں پھیلی ہوئی ذات پات، سیّد، پٹھان، جلاہے کی تفریق کے خلاف ایک سبق آموز احتجاج ہے۔لڑکی سیمؔا جوایک سیّد گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، ایک پٹھان لڑکے، سلیم کودل دے بیٹھتی ہے۔ سلیمؔ بھی اسے دل وجان سے چاہتا ہے لیکن لڑکے کے چچا فہیم ان دونوں کوایک ہونے نہیں دیتے۔ آخر دونوں گھر سے بھاگ جاتے ہیں اور ہفتوں مارے مارے اور خود کو چھپاتے پھرتے ہیں۔ادھر چچا فہیم ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ کسی طرح وہ دونوں مل جائیں۔آخر انہیں پانے میں کامیابی مل جاتی ہے۔ چچا لڑکی پر زبردستی دباؤ ڈال کر سلیم کو اغوا کر کے جھوٹے الزام میں پھنسا کر جیل بھجوا دیتے ہیں۔اس واقعہ کے ۱۶؍برس گزر گئے۔ ۱۷؍برس کی سیمؔا اب ۳۳؍برس کی ہوگئی لیکن اسکی شادی کہیں نہیں ہوئی۔آخر چچا نے ایک رشتہ لایا جو یہ سب کچھ جان کر بھی شادی کے لئے رضا مند تھا۔لڑکا بہت بڑا کاروباری تھا۔اس کے لوگوں نے یہ رشتہ طے کیا تھا۔لڑکی کے چچا نے بھی لڑکے کو دیکھا نہیں تھا۔شادی کے روز گاڑیوں میں جب دولہا آتا ہے تو اس کے والد اور چچا یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ یہ دولت مند کاروباری لڑکا کوئی اور نہیں، سلیم ہے، جسے انھوں نے سیمؔا کے اغوا کے جرم میں جیل پہنچا دیا تھا۔ اس وقت اُن کی تمام اَکڑ دولت کے سامنے ختم ہوجاتی ہے۔اس طرح سیمؔا اور سلیمؔ ایک دوسرے کے ہوجاتے ہیں۔

کردار

اس ناول میں درج ذیل کردار اہم ہیں :

سیمؔا۔ سلیمؔ خان۔ سید وسیم احمد۔ سید فہیم احمد وغیرہ۔

ان کرداروں میں سیمؔا ہیروئن ہے اور پوری کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یہ سیما کی آپ بیتی ہے۔اسلئے یہاں صرف دو کرداروں سیمؔا اور سلیمؔ پر توجہ دی جارہی ہے۔

سیما

سیما اس کہانی کی ہیروئن ہے، جو بہت خوبصورت ہے، جس کی آنکھیں غزالہ جیسی ہیں۔ بقول مصنفہ ''سیما علم و ہنر، سلیقہ، شکل وصورت میں اطراف و جوانب کی ساری لڑکیوں میں ممتاز تصوّر کی جاتی تھی۔ ماں باپ بھی سب بچوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔'' سیما کے والد سید وسیم احمد چندرنگر کے ہائی اسکول کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ہیں، جن کا اپنا '' پھلوں اور پھولوں سے ہرا بھرا باٹ، دودھ کیلئے گھر میں گائے موجود، مچھلیوں سے بھرا تالاب، ہر موسم میں ہر طرح کی ترکاریاں اور کیا کچھ نہ تھا۔'' سیما کے والد کے اسکول میں ایک انگریزی زبان کے ٹیچر کی ضرورت تھی۔ سیما دسویں جماعت میں پہنچ چکی تھی۔اسی علاقے کے ایک نوجوان سلیم خان جو انگریزی زبان وادب میں ایم۔اے کا امتحان دیکر فارغ ہوا تھا، اور جسے سید وسیم احمد نے اپنے اسکول اور گھر پر سیما کو انگریزی پڑھانے پر راضی کرالیا تھا۔ سیما اور سلیم تدریس وتعلیم کے دوران ایک دوسرے کے ذہنی طور پر بہت قریب ہوگئے۔ یہ قربت آٹھ ماہ کی مدت میں شدید محبت میں تبدیل ہوگئی۔ سیمؔا کہانی کی ابتدا میں بڑی سنجیدہ اور معصوم نظر آتی ہے اور اپنے دل کی بات اپنی زبان پر نہیں لاتی۔لیکن جب دسویں جماعت کا امتحان ختم ہوجاتا ہے اور سلیم مزید اعلیٰ تعلیم کیلئے لندن جانے والا ہوتا ہے تو وہ برملا اظہار کردیتی ہے اور کہتی ہے کہ سلیم کے جانے کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ادھر سلیم بھی اپنی بیوہ بہن، جس نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا، کے ہزار اصرار کے باوجود سیمؔا کو چھوڑ کر لندن جانے پر راضی نہ ہوا۔آخر کار جب معلوم ہوا کہ سید گھرانے کی لڑکی کسی خان سے شادی کر ہی نہیں سکتی اور اسے ہر حال میں اپنی برادری ہی میں کرنی ہوگی۔ سیما کے چچا سید فہیم احمد جو پیشے سے وکیل ہیں، کسی قیمت پر یہ شادی ہونے نہیں دیں گے تو سیمؔا بغاوت پر آمادہ ہوجاتی ہے اور سلیم کے ساتھ فرار اختیار کرتی ہے۔ یہاں اس کے کردار میں استقامت نظر آتی ہے اور زمانے سے ٹکرانے کے جذبے کی جھلک ملتی ہے۔ سیمؔا سلیم کے ساتھ آٹھ مہینوں تک مختلف ''اٹھارہ شہروں'' میں چھپتے رہے۔''اس وقت اس کا نازک دل کسی انجانے خوف سے کس قدر دھڑکتا رہتا تھا۔کتنی بھوک اور پیاس برداشت کرنی پڑتی تھی، کتنی راتیں جاگ جاگ کر اس نے کاٹ دی تھیں۔ تین تین دن اور راتیں مسلسل بیل گاڑی ہی پر گذر گئی تھیں۔ سات روز صرف ٹیکسی ہی پر گھومتی رہی تھی۔اور کئی راتیں کشتی پر گذریں۔کبھی تو سڑکوں پر اور کبھی ریل پر، اور کبھی اسٹیچر پر، کبھی دریا کے کنارے۔کسی جگہ بھی اسے اطمینان وسکون میسّر نہ ہوسکا تھا۔اور کسی جگہ بھی پورے آٹھ روز قیام نہ کرسکی تھی۔ ہر وقت صرف یہی فکر وتردد کہ کہیں گرفتار نہ ہوجائے۔کوئی دیکھ نہ لے۔کہیں کوئی گھر پر خبر نہ کردے۔کہیں

وہ لوگ آ کر مجھے لے نہ جائیں۔ کہیں ہم لوگ آپس میں جدا نہ ہو جائیں۔''

یہاں تک سیما کا کردار فطری ہے۔ یہاں وہ ایک کمسن، معصوم اور خوف زدہ عاشق نظر آتی ہے لیکن اُسی وقت اس کا کردار بالکل ہی بدل جاتا ہے جب وہ دونوں شادی کرنے کیلئے رجسٹرار کو اپنا صحیح نام و پتہ لکھ کر بھیجتے ہیں۔ جب شادی کی تاریخ کی صبح تمام تیاریوں کے بعد رجسٹرار کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ دروازے کھولنے پر وہ یہ دیکھ کر ششدر و حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کے چچا سید فہیم احمد رجسٹرار بن کر آئے ہیں۔ وہ آتے ہی قہقہہ مار کر چوٹی پکڑ کر سیما کو گھسیٹ کر لے جانا چاہتے ہیں، تو وہ ایک شیرنی بن جاتی ہے اور اپنے ناخنوں سے ان کے چہرے کو بری طرح زخمی کر دیتی ہے، اور بے تکان بول اٹھتی ہے۔ ''بے ایمان، دغا باز، ظالم، غدار، میرا ہمیشہ کا دشمن چچا، ابّا کو دھوکے دے دے کر کھاتا رہا اور اس وقت بھی انہی سے روپے لے کر مجھے لینے آیا ہے۔'' ایک طمانچہ اس کے گال پر ایسا رسید کیا کہ چشمہ گر کر ٹوٹ گیا۔ پھر پورے دانت اسکے بازو میں پیوست کر دیے۔ جب اسکے چچا زبردستی اسے گھر لے جاتے ہیں اور سلیم کو اغوا کے جھوٹے مقدمہ میں پولیس سے ساز و باز کر کے گرفتار کروا دیتے ہیں اور کورٹ میں جرح کے وقت وہی سیما اپنے چچا کے ظلم کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو جاتی ہے کہ ''چچا کی سکھائی باتیں دُہرا گئی۔'' یہی کہ ''شام کے وقت پارک میں سیر کے لئے میں گئی تو وہاں سلیم موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''میرے گھر چلو گی؟'' کیوں۔؟.....میری آپا نے تمہیں بلایا ہے.....امّی سے پوچھ لوں.....اس میں پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟ کچھ زیادہ دور تو ہے نہیں۔ جاؤ اور مل کر چلی آؤ.....یہ کہہ کر وہ مجھے اپنی بہن کے گھر لے گیا۔ گھر میں وہ نہ تھیں اس نے اپنے کمرے میں بیٹھا کر کہا۔ دیکھو یہ کتنا خوشبودار سنٹ ہے۔'' اس شیشی کو ناک سے لگاتے ہی مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔''

اس بیان کے بعد جب سلیم سے جج نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح کہہ رہی ہے تو ''اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔'' جی ہاں بالکل سچ کہہ رہی ہے۔''

سیما کا یہ رویہ اسے پھر ایک مجبور اور بے بس لڑکی کے روپ میں لا کھڑا کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مسلم معاشرے میں پلنے اور بڑھنے والی اس وقت کی عام لڑکی بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس بات پر اڑی رہتی ہے کہ وہ شادی کسی سے نہیں کرے گی۔ لیکن چڑھتی عمر کے ساتھ اسکی سوچ میں بھی تبدیلی آتی ہے اور جب اسکی عمر ۳۳ برس کو پہونچ جاتی ہے تو وہ والدین کے اصرار پر تیار ہو جاتی ہے۔ یہ اسکا فطری عمل تھا۔ انسان کا ہر لحظہ بدلتے رہنا اسکی جبلّت میں شامل ہے۔ دنیا میں بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نظریے یا اصول پر مرتے دم تک قائم رہتے ہیں۔ سیما ان لوگوں میں نہیں، وہ حالات کے ہاتھوں مجبور بھی ہو جاتی ہے اور وقت کے ساتھ سمجھوتہ بھی کر لیتی ہے لیکن جب اجنبی شوہر کی شکل میں اس کا اسکا چاہنے والا سلیم مل جاتا ہے تو اس نے ''جذبات سے بے قابو ہو کر سلیم کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اور اس کی ہتھیلیوں میں اس نے اپنا چہرہ چھپا کر دریائے محبت کے لازوال سوتوں کے عمق میں جدائی کی جمع شدہ ساری تکلیفوں، دردوں، کربوں اور یاسوں کی سخت اور پتھریلی چٹانوں کو بہا دیا۔''

سلیم

سلیم چندر نگر کی ایک بستی بلکہ ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا ہے۔ اسکی پرورش اسکی بیوہ بڑی بہن نے کی اور اسے انگریزی زبان میں ایم-اے- کرایا۔ سلیم اپنے نام کی طرح سلیم الطبع، نیک اور مہذب لڑکا ہے۔ ابھی وہ امتحان سے فارغ ہی ہوا ہے کہ اسے کچھ دنوں کیلئے چندر نگر کے ہائی اسکول میں انگریزی پڑھانے کے علاوہ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کی بیٹی سلیمہ، جو دسویں کی طالبہ ہے، کو بھی انگریزی پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ دورانِ تدریس سلیم، سیما میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اسے دل و جان سے پڑھاتا ہے۔ سیما بھی سلیم کی قربت اور اسکی دلچسپی کا جواب اثبات میں دیتی ہے۔ سلیم آٹھ ماہ پڑھانے کے بعد جب سیما کا امتحان ہو چکا ہوتا ہے، اپنی بہن کے اصرار پر لندن اعلیٰ تعلیم کے لئے جانے کی تیاری کرتا ہے۔ اگرچہ وہ دل سے نہیں چاہتا ہے کہ سلیمہ کو چھوڑ کر جائے لیکن اپنی بہن کی خواہش کو ٹھکرا بھی نہیں سکتا ہے۔ جب وہ سلیمہ سے مل کر یہ بتاتا ہے کہ وہ تین سال کیلئے اس سے دور ہونے جا رہا ہے۔ اس وقت سلیمہ کے ضبط کا بندھ ٹوٹ جاتا ہے اور برملا کہہ دیتی ہے کہ میرا کیا ہوگا، میری تو شادی گھر والے کر دینگے۔ وہ دونوں چاہتے تھے کہ جب تک تعلیم مکمل نہ ہو، شادی رُکی رہے لیکن بات طے ہو جائے۔ لیکن اس میں سب سے بڑی رکاوٹ سلیمہ کی سیدانی اور سلیم کا خان ہونا ہے۔ سلیمہ کے والد شاید سلیم کی شرافت اور صلاحیتوں کی وجہ سے راضی ہو بھی جاتے لیکن اس کے چچا جو پیشہ سے وکیل ہیں، کسی طرح بھی راضی نہیں ہوتے۔ اس طرح گویا انھوں نے اعلان کر دیا تھا کی یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ لہذا دونوں اپنی محبت کو کامیاب بنانے کیلئے فرار ہو گئے۔ سلیم، سیما کو لئے مہینوں مختلف مقامات پر چھپتا رہا اور آخر اس نے رجسٹرار کو اپنا صحیح پتہ اور نام لکھ

بھیجا کہ وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھنا چاہتے ہیں اور وہ آ کر تمام ضروری کارروائی پوری کر لے۔شادی کی تاریخ کی صبح رجسٹرار کی جگہ سیما کے چچا دروازے پر دستک دیتے ہیں اور سیما پر ظلم وتشدد کر کے اسے لے جاتے ہیں اور پولیس کے ساتھ ساز باز کر کے اغوا کے جھوٹے مقدمے میں سلیم کو پھنسا کر جیل بھجوا دیتے ہیں۔سلیم کے جیل جانے میں سیما کا بیان کارآمد ثابت ہوا جو وہ اپنے گھر والے خصوصاً چچا کے دباؤ میں آ کر جج کے سامنے بیان دیتی ہے کہ سلیم بہانے سے اسے اکیلے میں اپنے گھر بلا کر اور اسے بے ہوشی کی دوا سنگھا کر اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔سلیم خاموشی سے سنتا رہا اور جج کے پوچھے جانے پر ''نہایت ہی سنجیدگی سے جواب دیا۔جی ہاں بالکل سچ کہہ رہی ہے۔''

یہاں سلیم کا کردار بہت بلند ہو جاتا ہے وہ اپنی محبت کی خاطر سب کچھ سہنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے اور سارا الزام اپنے سر لے کر اپنی محبوبہ کے دامن کو آلودگی سے بچا لیتا ہے۔یہ ایسی قربانی ہے جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔اسکے بعد سلیم جیل کی صعوبتیں جھیل کر جب رہا ہوتا ہے تو کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے شہر چھوڑ دیا کیونکہ اسکی جدائی کے غم میں اسکی بیوہ بہن انتقال کر جاتی ہے۔

اسطرح ایک مدت دراز گذر جاتی ہے۔سیما عمر کی ۳۳ ویں منزل پر قدم رکھتی ہے۔سلیم بھی پختہ عمری کی سرحد میں پہونچ چکا ہے۔وہ تجارت کے ذریعے کافی دولت اکٹھی کر لیتا ہے۔عالیشان مکان،نوکر چاکر قیمتی گاڑی سب کچھ اسکے پاس موجود ہوتے ہیں۔اب وہ کاروباری حلقوں میں مسٹر خان کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔اسکے باوجود مجرد زندگی گزارتا ہے۔اسکے سینے میں سیما کی یاد محفوظ رہتی ہے۔اسی دوران اسے خبر ملتی ہے کہ سیما کی شادی ابتک نہیں ہو پائی ہے۔وہ اپنی شناخت کو چھپاتے ہوئے اپنے معتمد لوگوں کے ذریعے سلسلۂ جنبانی کرتا ہے۔سیما کا چچا جو اسکی شادی کرانے کی فکر میں لگا رہتا ہے، تیار ہو جاتا ہے، سیما سے اسکی شادی کروانے کیلئے، بغیر یہ جانے کہ یہ مسٹر خان کون ہیں۔ویسے وہ مخبر کے ذریعے مسٹر خان کے آدمی پر سیما کے ماضی کے واقعات ظاہر کروا دیتے ہیں۔اسکے باوجود مسٹر خان شادی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور عین بارات کے دن جب وہ دولہا کے روپ میں آتا ہے تو سب اسے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔چچا جو ابتک برادری سے باہر شادی کی مخالفت کر رہے تھے اور جن کی ضد کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے، وہ بھی اب مسٹر خان سے مرعوب نظر آتے ہیں اور شادی کی رات جب سیما کے سامنے سلیم (مسٹر خان) یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہی اس کا اپنا سلیم ہے تو سیما کی ویران زندگی میں بہار آ جاتی ہے۔

سلیم کا کردار جب مسٹر خان کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے تو قاری کی نظر میں اسکی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔کیونکہ سلیم کا سیما کی یاد میں اپنی زندگی مجرد گزارنا اور یہ معلوم ہونے پر کہ سیما ابتک بن بیاہی بیٹھی ہے، اس سے شادی کرنے پر راضی ہو جانا، جہاں اسکی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے، وہیں اسکی محبت کی سچائی اور ایمانداری کی دلیل بھی ہے۔کیونکہ سیما نے کورٹ میں اسکے ساتھ جس طرح کا برتاؤ کیا تھا اور جس نے اس کو جیل تک بھجوا دیا تھا، اگر وہ اعلیٰ اخلاق کا علم بردار نہ ہوتا اور اسکے دل میں سیما کے لئے سچی محبت نہ ہوتی تو کب کا شادی بیاہ رچا کر اپنا گھر بسا لیتا۔لیکن اس نے ایسا نہیں، بلکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ صرف سیّد ہونے ہی سے کوئی فرد اچھا اور اعلیٰ نہیں ہوتا ہے۔بلکہ اوصاف حمیدہ کسی بھی ذات،فرقہ یا طبقہ میں موجود ہو سکتے ہیں۔

موت کا سایہ

اس ناول کے ابتدائی ۳ صفحات میں پرویز شاہدی کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اشاعت سے تین سال قبل ہی تیار ہو گئی تھی۔کیونکہ پرویز شاہدی کی وفات مئی ۱۹۶۸ء میں ہوئی تھی۔مقدمہ کے ابتدائی حصّے میں پرویز شاہدی نے مصنفہ صغریٰ سبزواری کی سماجی اور ادبی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔بعد میں اس ناول کے متعلق فرمایا ہے:

> ''..........زیر نظر کہانی (ناول یا ناولٹ) صغریٰ بیگم سبزواری کی پروازِ تخیل کا ایک تحریری پیکر ہے۔محترمہ اس میدان میں بھی قابل توجہ ہو سکتی ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔کہانی کو پڑھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ محترمہ اس صنف میں بھی ناکام نہیں......''

پرویز شاہدی کی رائے سوفی صد درست ہے اور انھوں نے صرف دلجوئی یا حوصلہ افزائی کیلئے یہ کلمات نہیں لکھے۔اس ناول کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔یہ ایک جاسوسی ناول ہے۔ایک نوجوان دیپک' جو اپنے بوڑھے چچا نمل رائے اور اپنی پھوپی لیلاوتی دیوی' رائے صاحب کے حقیقی صاحبزادے رتن کے ساتھ رہتا ہے۔رتن ہاسٹل میں رہ کر انجینیرنگ کی پڑھائی پڑھ رہا ہے اور چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔ایک شام دیپک پر چائنا ریسٹورنٹ میں گولی سے حملہ ہوتا ہے جس سے وہ بال بال بچ جاتا ہے۔جس وقت یہ حملہ ہوتا ہے، اُس وقت وہاں مسٹر خان' جو شہر کے مانے ہوئے جاسوس ہیں، بیٹھے ہوتے ہیں۔انھیں کے ہمراہ دیپک گھر واپس آتا ہے۔جس سے دیپک اور مسٹر خان اور ان کی فیملی کے لوگوں سے تعلقات بڑھ جاتے ہیں۔دیپک مسٹر خان کو بتاتا ہے کہ ایک بار سیالدہ میں اس کو گاڑی سے

کچل دینے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ دیوالی کی رات جب تمام مہمان پٹاخے چھوڑنے اور دعوت اڑانے میں مشغول تھے، رتن کا قتل ہوجاتا ہے۔ اور کہا جانے لگا کہ دیپک کے دھوکے میں رتن، کا قتل ہوا کیونکہ رتن، دیپک کی شال اوڑھے تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد نمل رائے کے ہارٹ فیل ہونے سے موت ہوجاتی ہے۔ مسٹر خان کو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ قاتلانہ حملہ، دیپک پر، رتن کا قتل اونمل رائے کا ہارٹ فیل ہونے سے موت، اس کے پیچھے انھیں سازش لگتی ہے اور وہ اس کیس کو سلجھانے میں لگ جاتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد مسٹر خان اپنے گھر پر دیپک، اسکی پھوپی، اسکے خاندانی ڈاکٹر برمن اور پولیس کے اعلی اور دیگر معزز مہمان جن سے ان کی ملاقات دیپک کے گھر ہوتی تھی، سب کو مدعو کرتے ہیں۔ سبھوں کو حیرت ہوتی ہے کہ مسٹر خان جو کبھی کسی کو گھر پر دعوت نہیں دیتے، آج اس فیاضی کا راز کیا ہے۔ دعوت کے بعد مسٹر خان ایک مختصر سی تقریر کرتے ہیں اور اس میں تفصیل سے یہ انکشاف کرتے ہیں کہ رتن اور نمل رائے کا قاتل کون ہے؟ اور جب یہ بتاتے ہیں کہ ان دونوں کا قاتل دیپک ہے تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس قتل کے پیچھے چچا کی جائداد ہے۔

اس مختصر ناول میں صغریٰ سبزواری کا انداز تحریر بہت ہی خوبصورت اور پُر اثر ہے۔ انہیں کہانی بیان کرنے کا فن آتا ہے۔ کہانی میں شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے، جو کہانی کا اہم جزو ہے۔ ان کی زبان بڑی صاف ستھری اور پُر اثر ہے۔ کہیں کوئی ایسا لفظ یا جملہ نہیں جس سے کہانی کی روانی میں رکاوٹ پیدا ہو۔

کہانی میں مرکزی کردار دیپک اور مسٹر خان کا ہے۔ ان ہی دو کرداروں کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ لیکن ان کرداروں کو جس قدر ابھر کر سامنے آنا چاہئے تھا، وہ نہیں ہو پایا۔ میرا خیال ہے کہ اگر صغریٰ سبزواری صاحبہ ان کرداروں پر تھوڑی محنت اور کرتیں، تو شاید مسٹر خان کو اردو کے قاری فریدی کی طرح یاد رکھتے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کی ایک اہم کوشش ہے، جسے سراہنا چاہئے۔

شہر تواں

ناول نگار ناول کے ابتدائی صفحہ میں رقمطراز ہے :

''مصنف کی اجازت اور باقاعدہ معاہدے کے بغیر اس ناول کو فلمایا نہیں جاسکتا'' لیکن حقیقتاً یہ ناول نہیں ہے بلکہ مختصر داستان ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ''داستانی ناول'' کہا جاسکتا ہے۔ ناول میں صرف چار کردار ہیں جن کے متعلق ناول نگار شروع میں یوں لکھتے ہیں :

> ''شہر تواں سے دو میل کے فاصلے پر ندی کے اس پار سنسان بیابان جنگلوں میں چھوٹا سا ایک جھونپڑا تھا۔ اس میں رہنے والے چار شخص تھے۔ جمیلہ یعنی انور کی ماں، انور اور ان کے دو ساتھی چنو اور منو۔''

ناول کا ہیرو انور جو ایک غریب نوجوان ہے۔ فقیر کو کھانا کھلانے کے بدلے میں اسکی دعا اور طلسماتی امداد سے مہمات پر نکلتا ہے۔ اور پریوں، دیوی کی مدد سے ''پتھر نور'' جو علاً والدین کے چراغ کی طرح طلسماتی ہے، کی اصولیابی کے بعد حکومت، دولت گویا دنیا کے تمام سامانِ عشق حاصل کرلیتا ہے۔

یہ ایک طرح سے اردو کی کئی داستانوں کا چربہ ہے، جسے نوآموزی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ زبان اور اسلوب میں بھی کوئی کشش نہیں ہے۔

وفا کی ڈور

مصنفہ روحی قاصی نے اپنی اس تخلیق کو ''اصلاحی' معاشرتی' سماجی ناول'' کہا ہے۔ ناول کے بارے میں مزید لکھتی ہیں کہ :

> ''یہ ناول میری دوسری کاوش ہے۔ میری پہلی کوشش ''سلگتی چاندی'' (افسانوی مجموعہ) کی شکل میں نمودار ہوئی تھی.....میرا یہ ناول نہ کسی مقصد کی تحریک ہے اور نہ کسی خصلت کی تذلیل ہے، یہ تو.....رومی کا.....ایک معصوم کردار ہے جس کے پُر خلوص جذبات اور اسکی عکاسی آپ کے دل پر گھر کریگی.....راحیل.....وقت کی نیرنگیاں' محبت کی مجروح راہیں اور زندگی کے تلخ واقعات کے باوجود ''خودی'' کو نہ گم کرسکا.....بلکہ ان واقعات سے دو چار ہوکر اور بھی مضبوط کردار کا مالک ہوگیا۔''

مذکورہ اقتباس پر کوئی تبصرہ کئے بغیر میں ناول کا پلاٹ بیان کرتا ہوں۔ وہ یوں ہے کہ دو بچے راحیلؔ اور رومیؔ جب دونوں ۱۲ اور ۸ برس کی عمر کے تھے، ایک دوسرے کو بے حد پسند کرنے لگتے ہیں۔ راحیلؔ کی والدہ رقیہؔ بیگم بڑی سخت مزاج اور ظالم ہیں۔ جبکہ رومیؔ کی والدہ بیوہ ہونے کے باوجود رحم دل اور سنجیدہ اور باشعور ہیں.... راحیلؔ کے ماموں یعنی رقیہؔ بیگم کا بھائی شکیل، رومی کی والدہ سیماؔ سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اس سے شادی کر لیتا ہے اور بمبئی میں جا بستا ہے۔ راحیل گھر سے بھاگ کر بمبئی چلا جاتا ہے اور ایک امیر گھر کے لوگ اسکی پرورش کرتے ہیں۔ اس گھر سے منسلک لڑکی شیباؔ، راحیلؔ کو پسند کرنے لگتی ہے۔ لیکن راحیلؔ کے دل و دماغ میں رومیؔ بسی ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے۔ دونوں ایک ہی شہر میں رہ کر پروان چڑھتے ہیں اور زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ راحیلؔ بڑا ہو کر ایک کامیاب آرٹسٹ بن جاتا ہے اور اسکی تصویروں کی نمائش شیباؔ کرتی ہے۔ اس نمائش میں رومیؔ بھی جاتی ہے۔ شیباؔ سے جب معلوم کرتی ہے کہ ان کی تصویروں کے آرٹسٹ کون ہیں تو وہ بتا دیتی ہے کہ آرٹسٹ کا نام راحیلؔ ہے۔ یقین اور شک کے دائرے سے نکل کر بالآخر رومیؔ اور راحیلؔ دونوں آپس میں مل جاتے ہیں۔

ناول کی زبان بہت سپاٹ اور سادہ ہے۔ مصنفہ کو کردار نگاری پر کوئی دست رس نہیں ہے۔ وہ کسی بھی کردار کو اچھی طرح اجاگر نہیں کر سکیں، اور نہ کوئی کردار ابھر کر سامنے آیا۔ غرض، یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہے۔

بھنور

''بھنور'' بشیر الدین ظامی کا پہلا ناول ہے جسے انھوں نے خود پاکٹ بک سائز میں شائع کیا ہے۔ اس ناولٹ کا پلاٹ یوں ہے کہ ایک مجرا کرنے والی طوائف، جسکا نام رتناؔ ہے اور جو مصیبت کی ماری ہے، جس کا گھر بار، ماں باپ سب سیلاب میں ختم ہو گئے۔ وہ اور اسکی چھوٹی بہن چونکہ تعلیم کی غرض سے ہوسٹل میں رہتے تھے اس لئے بچ گئے۔ کوئی سہارا نہ تھا۔ ایک جوان بے سہارا لڑکی کیلئے جینا کتنا دشوار ہو جاتا ہے، یہ سب جانتے ہیں۔ اسکے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اسکی عزت چلی گئی۔ وہ خودکشی کرنے جا رہی تھی کہ ایک بوڑھی نائیکہ ایسے میں اس کی ''مددگار'' بن کر سامنے آئی اور اسے بچا کر کوٹھے میں لے گئی۔ جہاں وہ صرف گانا گانے کا کام کرتی تھی اور جہاں اپنی عزت کو محفوظ رکھنے میں کامیاب تھی۔

رمیشؔ جو اپنی بیوی کی بے راہ روی سے تنگ آ کر شراب اور کوٹھے کا سہارا لیتا ہے، رتناؔ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ رتناؔ بھی اُس میں دلچسپی لینے لگتی ہے اور یہ وعدہ کرتی ہے کہ جلد ہی اُس سے شادی کر لے گی۔ اسی دوران رمیشؔ کی بیوی کامنیؔ، رتناؔ سے ملتی ہے، اپنا دکھڑا سناتی اور اپنی بے راہ روی کی وجہ بتاتی ہے اور اس پر وہ شرمندہ بھی ہوتی ہے۔ دراصل وہ رتنؔ نامی ایک شخص کے پھندے میں اسطرح پھنس جاتی ہے کہ اس سے نکل نہیں پاتی ہے۔ رتنؔ کے پاس اسکی نازیبا حرکتوں کی کچھ تصویریں ہوتی ہیں۔ ان تصویروں کی وجہ سے رتنؔ اسے Black mail کرتا ہے۔ رتناؔ یہ سب سن کر اسکو رتنؔ کے چنگل سے رہائی دلانے کیلئے کمربستہ ہو جاتی ہے۔ وہ کامنیؔ کے ساتھ رتنؔ سے ملتی ہے اور اس کی اسمگلنگ کے دھندے میں اسکا شریک کار بن جاتی ہے۔ وہ وہاں رہ کر پولیس کو سارے راز بتاتی رہتی ہے۔ پولیس متواتر ان کے لوگوں کو سامان کے ساتھ گرفتار کرتی جاتی ہے جس سے رتنؔ بالکل پریشان ہو جاتا ہے۔ رتنؔ کو جب معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے کرتوت رتناؔ کے ہیں تو وہ اسکی جان لینا چاہتا ہے۔ لیکن بروقت اس کے آ جانے سے وہ خودکشی کر لیتا ہے اور اسکے گروہ کے افراد کچھ مارے جاتے اور کچھ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ رتناؔ جیل میں رمیشؔ کو اس وقت وہ تصویریں اور خط دیتی ہے جب وہ اسکی گرفتاری کی خبر اخبار میں پڑھ کر اس سے ملنے جاتا ہے۔ وہ خط میں رمیشؔ سے التجا کرتی ہے کہ وہ کامنیؔ کا قصور معاف کر کے اسے اپنا لے۔ رتناؔ کی ہدایت پر رمیشؔ عمل کرتا ہے اور کامنیؔ کو معاف کر دیتا ہے۔

ناول کا انداز بالکل فلمی ہے۔ لگتا ہے ناول نگار کا ذہن فلمی واقعات، حادثات اور مکالمے سے بُری طرح متاثر ہے۔ ویسے مصنف ترقی پسندوں کی طرح مزدوروں اور غریبوں کا ہمدرد نظر آتا ہے۔ اس کا اظہار وہ ناول میں جگہ بہ جگہ کبھی روانی کی حیثیت سے، کبھی کرداروں کی زبانی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہے۔

نئی زندگی

یہ بشیر الدین ظامی کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ایک سماجی اور رومانی ناول ہے، جس کا پلاٹ کچھ یوں ہے :

منیشؔ ایک غریب آرٹسٹ ہے، جسے آرٹس اسکول کی اپنی ہم جماعت شیلاؔ سے محبت ہو جاتی ہے۔ شیلاؔ، شہر کے رئیس رائے صاحب کی بیٹی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور منیشؔ اپنی محبت کو کامیاب بنانے کیلئے شیلاؔ کے کہنے پر رائے صاحب سے اس کا ہاتھ مانگنے جاتا ہے۔ رائے صاحب یہ سن کر

آگ بگولہ ہوجاتے ہیں اور منیش کو ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکال باہر کرتے ہیں۔ شیلا، منیش کو روکنے کی بہت کوشش کرتی ہے لیکن وہ نہیں رُکتا ہے اور وہاں سے نکل کر سیدھے اپنا گھر آتا ہے اور اسی دن اپنی ماں کو لیکر دوسرے شہر میں اپنی موسی کے گھر چلا جاتا ہے۔ اِدھر رائے صاحب زبردستی شیلا کی شادی راجیش سے کر دیتے ہیں، جو ایک بدکردار شخص ہے، اور جسے جُوا اور شراب کی لت ہے۔ شیلا کی ایک بیٹی ہوتی ہے وینا، جسے لیکر کچھ دنوں کے بعد شیلا اپنے میکے چلی آتی ہے۔ رائے صاحب کو جب راجیش کی حرکتوں کا پتہ چلتا ہے تو انہیں بے حد صدمہ ہوتا ہے اور اسی دوران رائے صاحب کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور انتقال کر جاتے ہیں۔ شیلا اب میکے میں رہتی ہے اور اس کی بیٹی بھی آرٹس کالج میں پڑھنے جاتی ہے۔ اِدھر منیش ایک جگہ منشی کی نوکری کر لیتا ہے اور اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اسکی ماں بھی گذر جاتی ہے اور وہ اکیلا ہو جاتا ہے۔ منیش کی ماڈل نیلم جو اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور منیش کے اکیلے پن کو دور کرنے کیلئے اسکی زندگی میں باضابطہ آجاتی ہے۔ منیش جو بھی تصویر بناتا ہے، اس میں بنانے والے کا نام شیلا لکھتا ہے اور جو انعام ملتا ہے، شیلا اسے مجبوراً قبول کرتی جاتی ہے۔

برسوں بعد شیلا کی بیٹی وینا اور منیش کا بیٹا دیپک ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس بار ماضی کو دہرایا نہیں جاتا ہے۔ شیلا یہ جان کر بھی کہ دیپک ایک غریب نوجوان ہے، اپنی بیٹی کا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ جبکہ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ دیپک کس کا بیٹا ہے۔ آخر میں جب وہ دیپک کے گھر والوں سے ملنے جام نگر جاتی ہے تو دروازے پر بھیڑ دیکھتی ہے اور تب پتہ چلتا ہے کہ منیش کا انتقال ہو گیا ہے۔ تب جا کر یہ راز کھلتا ہے کہ یہ وہی منیش ہے جسے کبھی شیلا نے چاہا تھا۔ آخر میں شیلا، نیلم دیوی، منیش کی بیوی اور بیٹا دیپک کو اپنے یہاں لے آتی ہے اور وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے ہیں۔

ناول کے کرداروں میں کوئی خاص جاذبیت نہیں۔ وہ محض ناول نگار کے اشارے پر چلتے ہیں، ان کا عمل حالات اور ماحول کے تحت کم ہی ہوتا ہے۔ پھر ظامی صاحب کے پہلے ناول سے یہ قدرے بہتر ہے، اور اسکی زبان بھی حقیقت سے قریب ہے۔ اندازِ بیان میں پہلے ناول کے مقابلے میں کچھ پختگی آئی ہے۔ طرزِ تحریر دلچسپ ہے لیکن کہیں کہیں بوجھل پن محسوس ہوتا ہے۔

خزاں کے بعد

یہ ایک رومانی ناولٹ ہے جس میں دو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان محبت کے رشتے کو پیش کیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ یوں ہے کہ سعید ایک ہونہار طالب علم ہے لیکن غربت کا مارا ہے۔ دوسری طرف مارگریٹ جو ایک عیسائی لڑکی ہے، مالی طور پر بہت امیر نہیں لیکن خوشحال ہے۔ دونوں ایک ہی تعلیمی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب یتیم سعید کے چچا نے اسکی تعلیم پر مزید خرچ کرنے سے انکار کر دیا اور اسے ہاسٹل سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا تو مارگریٹ نے اپنے یہاں پناہ دی۔ کچھ دنوں بعد سعید اپنے ایک دوست اسلم کے پاس بمبئی چلا گیا۔ اسلم فلم کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اس نے سعید کو جوہو کے اپنے بنگلے میں جگہ دی اور اپنے ساتھ کام پر رکھ لیا۔ سعید اور مارگریٹ گرچہ دونوں ایک دوسرے سے دُور تھے لیکن دونوں کو ایک دوسرے کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی تھی۔ ایک دن کام کے دوران بیلا جو ایک مشہور اداکارہ تھی، ایک رات اسٹوڈیو سے سعید کو یہ کہکر ساتھ لے کر نکلی کہ وہ اسے چھوڑتی ہوئی گھر چلی جائے گی لیکن راستے میں اس نے سعید کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔ سعید جو گاڑی چلا رہا تھا، توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایکسیڈنٹ کر بیٹھا۔ جس میں بیلا کو تھوڑی چوٹ لگی لیکن سعید بری طرح زخمی ہو گیا اور اسپتال میں مہینوں زیرِ علاج رہا۔ اسکے چہرے کی تمام خوبصورتی ختم ہو گئی۔ اسلم، مارگریٹ کو خط لکھ کر تمام باتوں سے آگاہ کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ سعید اپنے چہرے کی بدصورتی کی وجہ سے اپنی زندگی سے بے زار ہے۔ مارگریٹ کہتی ہے کہ اسے واپس کلکتہ لے آؤ۔ جب وہ کلکتہ آتا ہے تو مارگریٹ اس سے بہت محبت سے ملتی ہے اور اسے یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ سعید کے باطن کی خوبصورتی سے پیار کرتی ہے۔ سعید جو ابھی تک اپنے چہرے کی بدصورتی کی وجہ سے نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا شکار تھا، خوش ہو جاتا ہے۔

اس مختصر سے ناولٹ میں کوئی کردار پورے طور پر نہیں ابھرتا ہے۔ البتہ مس مارگریٹ اپنی اچھائی اور شرافت کی وجہ سے جاذبِ نظر ہے۔ حالانکہ محبت کے معاملے میں ایمانداری دونوں کے یہاں ہے اور دونوں کردار اعلیٰ اخلاقی صفات کے مالک ہیں۔

زبان میں کوئی دلکشی نہیں ہے۔ بیانیہ میں اس کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مکالمے اور جملوں سے کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ایک اوسط درجے کا ناولٹ ہے۔

جھاں آرا

کبریٰ بیگم کا یہ ناول فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ علی نظر وسیم نے تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے ناول کے تاریخی پس منظر کے بعد لکھا ہے کہ :

''جہاں آرا چونکہ کبریٰ بیگم کا پہلا ناول ہے اس لئے اسکے سلسلے میں یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ فنی اور تکنیکی خامیوں سے پاک ہے.....اس ناول میں فاضل مصنفہ نے دوسرے لکھنؤ یعنی مٹیا برج کے اس دور کی تہذیب کی عکاسی کی کوشش کی ہے۔

زبان و بیان، طرز معاشرت، طرز گفتگو، نشست و برخاست، شادی بیاہ کی رسمیں مثلاً مانجھا، مہندی، ساچق اور عقدِ نکاح وغیرہ کا بیان اس میں مصنفہ نے اس طرح کیا ہے کہ جب تک کسی نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ نہ دیکھا ہو اس کے لئے اس طرح بیان کرنا آسان نہیں ہے۔

پیش نظر ناول کی مصنفہ چونکہ خود بھی واجد علی شاہ خلد آشیانی کے سلسلۂ نسب سے تعلق رکھتی ہیں اور انکی پرپوتی ہیں چنانچہ انھوں نے جو کچھ بچپن سے دیکھا اور جس ماحول میں پرورش پائی اسکی عکاسی ان کیلئے چنداں مشکل ثابت نہیں ہوئی.....بہر حال تہذیبی اقدار کے عکاس ہونے کی حیثیت سے اس ناول کو ادبی قرار دینا ہی چاہئے۔''

فاضل مقدمہ نگار نے بڑا خوبصورت اور جامع مقدمہ لکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ آخری جملہ میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ ناول تہذیبی اقدار کا عکاس ہے، اس لئے ''ادبی'' ہے۔ کس ناول میں تہذیبی اقدار کی عکاسی نہیں ہوتی؟ کیا پریم چند سے لیکر کرشن چندر تک کے ناولوں میں کسی نہ کسی تہذیبی اقدار کی عکاسی نہیں ہے؟ کیا ان ناول نگاروں کے ناول ''غیر ادبی'' ہیں؟

اس ناول کے دو اہم کردار ہیں۔ ایک، افضل نواب اور دوسرا، جہاں آرا۔ ان دونوں کرداروں کی محبت کے بیچ جو کردار آتا ہے وہ عالم آرا کا ہے۔ اس کے علاوہ نزہت آپا، بڑی بہو، منجھلی بہو، ظفر نواب، زینت آرا، اطہر نواب وغیرہ کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ناول کا پلاٹ یوں ہے کہ مٹیا برج نواب خاندان کے محل میں مذکورہ کرداروں کی پرورش ہوتی ہے۔ سوائے عالم آرا کے وہ لکھنؤ سے آتی ہے اور افضل نواب کو اپنے دامِ الفت میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ جبکہ افضل نواب اور جہاں آرا بچپن سے ایک دوسرے کے قریب تھے۔ لیکن افضل نواب کی سخت گیری اور جہاں آرا کا حد سے زیادہ حساس ہونا، ان دونوں کو ملنے نہیں دیتے ہیں۔ جہاں آرا اپنے بھائی مسرور نواب کے یہاں مدھو پور غصّے میں چلی جاتی ہے اور وہیں بیمار ہو کر مر جاتی ہے۔ کہانی اسکی موت پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ناول میں جیسا کہ فاضل مقدمہ نگار نے فرمایا ہے کہ لکھنؤ اور دوسرے لکھنؤ (مٹیا برج) میں مقیم واجد علی شاہ کے شاہی خاندان کے افراد کی زندگیوں کی مکمل عکاسی کی گئی ہے، اور بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر شادی کی رسم کس طرح ادا ہوتی ہے، دیکھئے :

''.....جب یہ سب دولہا کے گھر پہونچے تو چھڑیاں کھیلی گئیں۔ مانگ میں صندل ڈالا گیا۔ عطر لگایا گیا، گلے میں سچے ہار اور گجرے پہنائے گئے۔ مراثنوں نے مبارک بادیاں گائیں، مہمانوں اور ایل خانہ نے ان کو انعامات سے نوازا۔ پھر تمام مہمان کو لاکر احترام سے مسند پر بیٹھایا گیا۔ شربت نوش کروایا گیا۔ اسکے بعد دولہا کی بہنیں دولہا کے سر پر آنچل ڈال کر دولہا کو لیکر مہمانوں میں آئیں۔ دولہا کو منڈھے کے نیچے چاندی کی چوکی پر بیٹھایا گیا۔ دولہا کے ساتھ افضل نواب اور دولہا کے بھائی بھی اندر آئے۔ افضل نواب دولہا کے قریب مسند پر بیٹھ گئے۔ جہاں آرا اور دلہن کی بہنیں سامنے مسند کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔''

اسکے علاوہ اس ناول میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ بڑی صاف، شستہ اور دلکش ہے۔ ناول میں اس مقام کا منظر دیکھئے جو افضل نواب، جہاں آرا کی بیماری کی خبر سن کر مدھو پور جاتے ہیں۔ جب جہاں آرا کے پاس جاتے ہیں تو وہ کس طرح اپنی آخری خواہش اپنی زبان پر لاتی ہے :

''میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں.....اگر میں مر جاؤں تو میری قبر آپ کے کمرے کے پاس والی زمین پر بنوایئے گا۔ آپ کے قریب رہنے سے مجھے سکون اور تسلّی رہے گی۔ آپ وہاں سے برابر آتے جاتے رہئے گا۔ میری قبر پر روزانہ آیا کیجئے

گا۔مجھکو بھول مت جائے گا۔''

جہاں آرا کی موت کا آخری منظر بھی بہت خوب ہے، دیکھئے :

''.....افضل بھائی کو دیکھ کر اسکی آنکھیں نم ہونے لگیں۔اور آنسوؤں کی دو موٹی دھار جہاں آرا کی دو کنپٹیوں سے گذر گئیں، اور آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند کرلیں۔یہ شام کا غمگین وقت تھا۔باہر ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی، سامنے دور تک دھان کا کھیت لہراتا ہوا پھیلتا چلا گیا۔دیکھتے دیکھتے زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا۔جہاں آرا کو سفید چادر اڑھادی گئی۔''

اسطرح ناول کی ہیروئن جہاں آرا ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہوکر مرجاتی ہے۔

پکار

یہ محمد قاسم علوی کی تصنیف ہے جس کے متعلق ان کا اپنا فرمانا یہ ہے کہ ''میں نے اپنی اس کتاب میں ایسے ہی گندے ماحول اور ناانصافی پر مبنی برے سماج کا ایک ہلکا سا نقشہ پیش کیا ہے۔'' جس میں تنویر اور راجو جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔''معاشرے سے اس گھناؤنی سازش کو بے نقاب کرنا ہے جو بڑے بڑے جٹہ دَھاری اور جبّہ ودستار والے شامل ہیں۔''

ویسے مصنف کے استاد محمد صابر القادری نسیم بستوی فرماتے ہیں :

''مولانا محمد قاسم علوی کی تازہ ترین تصنیف ''پکار'' ہے جسے میں نے موصوف کی دلی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شروع سے آخر تک پڑھا ہے۔اس افسانوی انداز کی کتاب میں مصنف نے حالات حاضرہ اور موجودہ سیاسی اور ملکی ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے تنویر کا جو جرأت مندانہ اور انسانیت نوازی کا بلند کردار پیش کیا ہے، وہ قوم وملت کی اعلیٰ قدروں کی نمائندگی کررہا ہے اور اس کا ایک ایک باب اتحاد ومحبت اور حق وصداقت کی شمع فروزاں کی طرح ذہن وفکر کی تاریکیوں کو پُرنور وتابناک بنادیا ہے۔''

نسیم بستوی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ :

''..... پکار کے ذریعے ملک وقوم کو جو خیال افروز پیغام دیا ہے وہ بلاشبہ دور حاضر کا اہم تقاضہ ہے۔اگر ہمارے ملک کے ناول نگار، افسانہ نویس اور شعراء حضرات اس رنگ کے تعمیری اور بامقصد ادبی شہ پارے منظر عام پر لائیں تو معاشرہ میں پھیلی ہوئی بہت سی نفرت وحقارت کی گندگیوں اور تعصب کی تباہ کن اور حیاسوز پستیوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔''

اس ''افسانوی انداز کی کتاب'' میں جو قصہّ بیان ہوا ہے وہ یوں ہے کہ ایک شخص شیخ احمد، جو مرتے وقت اپنے اکلوتے بیٹے تنویر کو نصیحتیں کرتا ہے کہ :

''صبر وضبط سے کام لینا جب تم انتہائی بے چارگی محسوس کرو تو اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوکر سکون وتحمّل کی دعا مانگنا.....تم اپنی ماں، باپ اور بہنوں کا انتقام لینے کی کوشش کروگے.....لیکن.....ضرور یاد رکھنا کہ جب کبھی بھی وہ وقت آئے تو انتقام کے جوش میں مجبوروں اور بے بسوں پر ظلم مت کرنا۔''

دراصل کسی مسلم کش فساد میں تنویر کی والدہ اور اسکی بہنیں دونوں ماری جاتی ہیں۔پھر اسکے والد کی موت واقع ہوجاتی ہے۔تنویر پوری طرح اکیلا ہوجاتا ہے۔تنویر کی پرورش نسیم احمد اور انکی بیگم کرتی ہیں۔جب وہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے اور اسکا شعور بیدار ہوتا ہے تو اسے اپنے والد کی بات یاد آتی ہے۔اپنی ماں اور بہن کا بدلہ لینے کی غرض سے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہوجاتا ہے۔جس کا سرغنہ احمد نام کا نوجوان ہے اور اس کے ڈاکو بننے میں انہیں وجوہات کا ہاتھ تھا۔دونوں کا مقصدِ حیات ایک ہے کہ ظالموں کو چن چن کر ہلاک کیا جائے۔اور اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

دوسری طرف ایک کردار راجو نام کا ہے جو مسلم فسادیوں سے بدلہ لینے کی غرض سے کمربستہ ہے وراپنا ایک گروہ بنا کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔

پھر بیلا پور کے پہاڑوں میں ہندو ڈاکوؤں اور مسلمان ڈاکوؤں میں جم کر جنگ ہوتی ہے۔دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھار ہوتی ہے اور مسلسل تین دونوں تک چلتی رہتی ہے۔اس طرح دونوں طرف کے تمام افراد (ہندو اور مسلمان) ختم ہوجاتے ہیں۔آخر میں مصنف لکھتے ہیں کہ :

''کاش.....ایک بار پھر جنگ ہوتی.....پھر بندوقیں چلتیں.....بم پھٹتے.....پھر خون بہتا.....مگر محبت کی سنگینوں سے نفرت کا جگر چھلنی کیا جاتا..... پریم کی چُھری سے کرودھتا ذبح کی جاتی.....تعصب کا گلا کاٹ کر زمین کے سب سے گہرے حصّے میں دفن کر دیا جاتا تا کہ انسان.....انسان بنتا.....ہندو پہلے انسان بنتا.....مسلمان پہلے انسان بنتا.....کاش ایسا ہوسکتا.....کاش!! کاش.....اے کاش!!!''

ان آخری جملوں سے یہ بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنف کا نظریہ کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ہندوستان میں آئے دن ہونے والے فسادات کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین سے یہ لعنت کسی طرح ختم ہوجائے۔ دراصل ''افسانوی'' تصنیف کا موضوع بہت ہی اہم اور آج کے تناظر میں قابل توجہ ہے۔ لیکن مصنف کو ناول کے فن کو برتنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ مصنف اکثر جگہوں پر اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہیں۔ کیونکہ ان کا لہجہ خطیبانہ ہوجاتا ہے۔ اگر تھوڑی محنت کی جاتی تو اس موضوع پر ایک اچھا ناول بن سکتا تھا۔ پھر بھی اس قابل ضرور ہے کہ اسے ایک بار پڑھ لیا جائے۔

دکھ کے بادل ، سکھ کی پھوار

اس ناول کی مصنفہ ثریا محمود ندرت ہیں۔ اس ناول کو مشورہ بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔ یہ ایک معاشرتی اور رومانی ناول ہے۔ کہانی کا انداز فلمی ہے۔ اسے پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''امراؤ جان ادا'' سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ اس کا پلاٹ یوں ہے: گل بہارؔ ایک ایسی طوائف ہے جو صرف اپنی آواز اور اداؤں کا سودا کرتی ہے اور ایک باعزت لڑکی کی طرح باعصمت ہے۔ وہ جس کوٹھے میں مقیم تھی اسکی مالکہ جی نازک نام کی تھی۔ گل بہارؔ کا اصل نام رضیہ تھا جو شیخ صاحب کی بیٹی تھی۔ شیخ صاحب کی دوسری بیوی سلیمہ، رضیہ کو بالکل نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جبکہ بظاہر بہت محبت جتاتی تھی۔ شیخ صاحب کی آنکھیں بند ہونے کے بعد اس نے رضیہؔ پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی بہن کے لڑکے عشرتؔ جو بہت اوباش تھا اور شیخ صاحب کی زندگی میں جسے گھر میں آنے کی مخالفت تھی' سے رضیہؔ کا رشتہ جوڑنا چاہتی تھی۔ جسے رضیہ بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ آخر تنگ آکر وہ گھر چھوڑ کر نکل بھاگتی ہے اور بدقسمتی سے پناہ لیتی ہے تو ایسی جگہ جہاں ناچ گانا اور جسم فروشی کا کاروبار ہوتا ہے۔ رضیہ کیلئے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ مجبوراً گانے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ لیکن ہر حال میں اپنی عزت کو بچائے رکھتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات شہابؔ سے ہوجاتی ہے۔ شہابؔ پہلی نظر میں اسکی محبت میں گرفتار ہوکر شادی کی تجویز رکھتا ہے۔ جسے رضیہ کچھ پس وپیش کے بعد قبول کر لیتی ہے۔ دونوں کی زندگی ابھی مزے سے گذر رہی تھی کہ شہابؔ کے دل میں رضیہ کی نسبت شک پیدا ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ شہابؔ کے تمام دوست رضیہ کی بہت تعریفیں کرنے لگے تھے۔ اس شک کی وجہ سے وہ شراب نوشی اختیار کرتا ہے اور اسی شراب کے نشے میں وہ رضیہؔ کو بُرا بھلا کہہ کر اور اسے اسکے ماضی کی زندگی کا طعنہ دیکر اسے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنی بچی کو لے کر کہیں نکل جائے۔ رضیہؔ گھر سے نکل کر برکت علی کے مکان کے دروازے پر گر کر مرجاتی ہے۔ برکت علی بچی کے رونے کی آواز سن کر باہر نکل آتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک رضیہ کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ بچی کو اٹھا کر اندر لے آتے ہیں اور پرورش کرنے کی غرض سے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور رضیہ کی تجہیز و تکفین کر دیتے ہیں۔ رضیہ کی بچی جو برکت علی کے یہاں پرورش پاتی ہے، جب جوان ہوتی ہے تو برکت علی چاہتے ہیں کہ اپنے بیٹے نہال کی شادی اس سے کر دیں۔ لیکن ان کی بیوی شاہدہ بیگم کسی قیمت پر تیار نہیں ہوتی کہ پتا نہیں یہ لڑکی کس خاندان اور نسل سے ہے۔ دراصل اپنے بیٹے کی شادی اپنی بہن کی بیٹی شمّو سے کرنا چاہتی تھی۔ ایک دن شہابؔ جو شاہدہ بیگم کا بھائی ہے، بری حالت میں اپنی بہن کے پاس آتا ہے۔ تب جا کر یہ راز کھلتا ہے کہ شہاب اور رضیہ کی بیٹی (صبا) ان ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح نہال اور صبا کی شادی ہوجاتی ہے۔

جب کہ شروع میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک رومانی اور سماجی ناول ہے لیکن مصنفہ کو واقعات کے بیان میں وہ قدرت حاصل نہیں، جو قاری کو اپنی گرفت میں رکھ سکے۔ تاہم یہ پڑھنے کے لائق ناول ہے۔

کرداروں میں شہاب شروع میں تو بڑی جواں مردی کا ثبوت دیتا ہے لیکن ایسی بے بنیاد بات پر رضیہ سے متنفّر ہوجاتا ہے جس سے اس کے کردار کی باطنی کمزوری اور مجہولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح رضیہؔ کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کے پھول کی طرح پاک رہتی ہے۔ وہ شہاب سے اپنے حق کیلئے احتجاج اور مقابلہ کرنے کی بجائے گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ دونوں اہم کردار فطری کم اور مصنفہ کی مرضی سے چلنے والے زیادہ نظر آتے ہیں۔

زبان صاف ستھری اور سلیس ہے اور انداز بیان سیدھا سادہ ہے۔ یہ ناول عام قاری کو پڑھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

غم کی چھاؤں میں

یہ ایک رومانی اور معاشرتی ناول ہے جس میں خاندانی چپقلش، عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور ان سے پیدا شدہ مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ یوں ہے کہ ساجد احمد ایک بیرسٹر ہیں جو مزاجاً مغرب پرست ہیں۔ان کے گھر میں بھی اسی مغربی تہذیب کا چلن ہے۔ان کی لڑکی فرحت کی تعلیم بھی مغربی طرز پر ہوتی ہے۔ان کی بیگم راحت بیگم بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔اس کے برعکس ان کے بڑے بھائی ساجد احمد کی طرز زندگی بالکل مشرقی ہے۔ان کی بیگم سہیلا بیگم اور ان کی دو بیٹیاں سائرہ اور سیما کی بھی زندگی اسی طرز کی تھی۔گرچہ وہ دونوں بھی زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہی تھیں۔اچانک ماجد احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔کچھ دنوں کے بعد ان کی بیگم سہیلا بیگم بھی گذر جاتی ہیں۔مرتے وقت انھوں نے اپنی دونوں بچیوں سائرہ اور سیما کو اپنی دیورانی راحت بانو کے سپرد کر گئی تھیں۔وہ دونوں راحت بیگم کے یہاں چلی آتی ہیں اور اپنی کوٹھی کو کرایہ پر اٹھا دیتی ہیں جسکی آمدنی راحت بیگم ان کی کفالت کے عوض لے لیتی ہیں۔ اسی دوران ساجد احمد کا بھی انتقال ہو جاتا ہے۔فرحت کی شادی ان کے رشتہ دار شہباز سے ہونا طے رہتی ہے۔انہی دنوں فیاض جوان لوگوں کے رشتہ داروں میں ہے،اور جس سے سائرہ کو قلبی لگاؤ ہے،لندن سے پڑھ کر واپس آتا ہے۔فرحت جب فیاض سے ملتی ہے تو اس پر فدا ہو جاتی ہے اب وہ شہباز کو چھوڑ کر اُسے اپنانا چاہتی ہے۔فیاض کے ملنے جلنے کا انداز بڑا پیارا ہے۔لوگ اسکی طرف ملتفت ہو جاتے ہیں۔ایک شام موقع پا کر شہباز،سائرہ کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے لیکن سائرہ بھاگ کر پہاڑی کی طرف نکل آتی ہے۔جہاں سیما اپنے منگیتر انجم کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے۔سائرہ کو ٹھوکر لگتی ہے اور وہ سر کے بل گر جاتی ہے،جس سے اسکی بینائی چلی جاتی ہے۔فیاض موقع غنیمت جان کر فرحت سے شادی کر لیتا ہے۔ادھر سیما اور انجم کی شادی بھی ہو جاتی ہے۔اس دوران ان کا ایک رشتہ دار نوجوان ڈاکٹر وقار آتا ہے جو چاہتا ہے کہ سائرہ کو اپنا لے۔لیکن سائرہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتی ہے۔وہ اپنی پہلی محبت کا غم لئے مر جاتی ہے۔

اس ناول میں بھی مصنفہ نے متمول مسلم گھرانے کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔اس ناول میں بھی شادی کے جھگڑے ہیں۔اور دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن انھوں نے زیادہ زور شادی کے جھگڑے پر دیا ہے۔

کردار نگاری کوئی خاص نہیں ہے۔فرحت جہاں مغربی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور اسی تہذیب کے زیر اثر جس سے نسبت طے ہوتی ہے،یعنی فرحت فیاض کو دیکھکر شہباز کو چھوڑ کر اس سے شادی کرنے پر تل جاتی ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔جبکہ سائرہ جو مشرقی تہذیب کی نمائندہ ہے اور جس کی نظر میں اس کا پہلا پیار ہی سب کچھ ہے۔جس کے لئے وہ اپنی زندگی بھی قربان کر دیتی ہے،جبکہ فیاض اس کے ساتھ بے وفائی کرتا ہے۔ان دو کرداروں کے علاوہ فیاض کا کردار بڑا متحرک ہے اور ایک جیتا جاگتا کردار نظر آتا ہے۔یہ ایک فطری کردار نظر آتا ہے جو اپنے اندر لچک پیدا کرنا نہیں جانتا۔وہ اپنی زندگی کو بہتر گذارنے کیلئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہے،لیکن دلچسپ ہے۔زبان و بیان بڑی پرکشش ہے۔

روٹھی طوفان سے ساحل تک

یہ ناول بھی ثریا محمود ندرت کا تحریر کردہ ہے۔یہ ایک رومانی ناول ہے۔اسے مشورہ بک ڈپو دہلی نے پاکٹ بک سیریز کے تحت شائع کیا ہے۔یہ کہانی نیّر نام کی ایک لڑکی کی ہے جو اپنے والدین (ایاز اور شمیمہ) کی اکلوتی بیٹی ہے۔جب وہ پانچ سال کی تھی تو دادی کا انتقال ہو گیا اور جب سن بلوغ کو پہنچی تو اچانک والد کا انتقال ہو گیا۔اس کے والد ایاز کی اچانک موت نے دونوں ماں بیٹی کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔گھر میں ان دونوں ماں بیٹی کے علاوہ ایاز کی بیوہ بہن ناظمہ اپنی دو لڑکیوں شوکت اور رفعت اور دو لڑکے اظہار اور افتخار کے ساتھ رہتی تھی۔جس کی کفالت بھی ایاز ہی کرتا تھا۔گھر پر ایک طرح سے ناظمہ ہی کی حکمرانی چلتی تھی۔ایاز کی موت کے بعد اسکی پھوپھی ناظمہ یہ چاہتی تھی کہ اس کے بیٹے اظہار کی شادی نیّر سے ہو جائے۔لیکن نہ تو شمیمہ کو رشتہ پسند تھا اور نہ ہی نیّر کو۔اسلئے کہ اظہار کسی لحاظ سے نیّر کیلئے موزوں نہیں تھا۔نہ تو اظہار تعلیم میں نیّر کی برابری کر سکتا تھا اور نہ ہی عادات و اطوار ہی اس کے اس قابل تھے۔اپنی بری عادتوں ہی کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکا تھا۔

شادی کیلئے جب ناظمہ بہت زیادہ دباؤ ڈالنے لگی تو شمیمہ،نیّر کو لیکر اپنی بڑی بہن نسیمہ کے یہاں اس بہانے سے چلی گئی کہ ان کی دو بیٹیوں کی شادی ہونے والی ہے اور ان دونوں ماں بیٹی کو وہاں جا کر ان کا ہاتھ بٹانا ضروری ہے۔شمیمہ کی دلی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی نیّر کی شادی اس کی بہن کے لڑکے احسان سے

ہوجائے۔لیکن جب احسان، نیّر کے والد کے انتقال کے بعد اپنے دوست عرفان کے ساتھ میت میں آیا تو نیّر پہلی نظر میں عرفان سے خاموش محبت کرنے لگتی ہے۔ جس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی ہے۔شادی کے بعد تحسین اور یاسمین اپنی سسرال کے لوگوں کے ساتھ دہلی لوٹ گئیں۔ان کے ہمراہ شمیمہ اور نیّر بھی دہلی چلی گئیں۔

جب ناظمہ بیگم کو شمیمہ کی آمد کی اطلاع ملتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ''نیّر منزل'' میں اتری ہے، فوراً اس سے ملنے پہنچ جاتی ہے۔اور چاہتی کہ ماں بیٹی اسکے گھر جا کر رہیں لیکن شمیمہ نے صاف انکار کر دیا کہ وہ نیّر منزل سے اب کہیں نہیں جائے گی۔وقت گزرتا جا رہا تھا۔اور شمیمہ کو اپنی بہن نسیمہ کے خط کا انتظار تھا کہ کب نیّر کیلئے احسان کا پیغام بھیجے۔نسیمہ بھی چاہتی تھی کہ احسان بہو لے آئے لیکن احسان ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔اسکے انکار سے نسیمہ کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے اور اس کے اصرار سے تنگ آ کر احسان گھر سے چلا جاتا ہے۔اس دوران احسان کے والد اور عرفان اور اسکے خاندان کے افراد نے بڑی ہوشیاری سے نسیمہ کی طبیعت کو بحال کیا اور عرفان نے احسان کو ڈھونڈ نکالا۔احسان نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ابتک نیّر کو اپنی بہن سمجھتا رہا ہے اس لئے اس سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لہذا بات نیّر اور عرفان کی شادی ٹھہری اور یہ طے پایا کہ شادی نسیمہ کے گھر سے کر دی جائے کیونکہ دلّی جا کر کرنے میں ناظمہ بیگم کی رخنہ اندازی کا ڈر تھا۔لیکن جب نیّر اور شمیمہ دلّی نہیں گئے تو ناظمہ خود اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ آدھمکی اور وہیں براجمان ہوگئی۔جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے تھے وہ اتنی ہی تلملاتی جا رہی تھی کیونکہ وہ نیّر کی شادی اپنے بیٹے اظہار یا افتخار سے کروانا چاہتی تھی۔اب جب کہ شادی کے چار دن باقی رہے تو صبح سویرے گھر میں یہ خبر آئی کہ رات کسی نے عرفان پر لاٹھی سے حملہ کر دیا ہے اور اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔حملہ آور کا پتہ نہیں لیکن قیاس کیا جانے لگا کہ یہ کام ضرور ناظمہ بیگم اور ان کے لڑکوں کی سازش کے تحت ہوا ہوگا۔خدا کا شکر کہ عرفان کو صبح ہوش آ گیا۔لیکن اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں عرفان اپنی یادداشت اور آنکھیں نہ کھو بیٹھے۔اور ایسا ہی ہوا، اس کی آنکھیں چلی گئیں لیکن یادداشت برقرار رہی۔ڈھائی ماہ کے بعد عرفان صحت یاب ہوگیا اور آپریشن کے ذریعہ اسکی بینائی بھی واپس آ گئی۔انسپکٹر واحد جو احسان کا دوست تھا، کی مدد سے عرفان کا نوکر قمر، جس نے افتخار اور اظہار کے اشارے پر عرفان پر لاٹھی سے وار کیا تھا، وہ گواہ بن گیا۔اس طرح افتخار کو تین ماہ کی سزا ہوتی ہے اور ناظمہ بیگم روتی پیٹتی اظہار کے ساتھ واپس دلی چلی جاتی ہے۔ادھر عرفان اور نیّر کی شادی ہوجاتی ہے۔

یہ کہانی ایک متمول کٹّر مسلم گھرانے کی آپسی چپقلش اور ریشہ دوانیوں پر مبنی ہے۔ساتھ ہی ساتھ رومانی بھی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کہانی کی فضا رومانی زیادہ ہے، سماجی کم۔کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ویسے مصنفہ نے بڑے سلیقے سے کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔طرز بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ قاری کہانی کار کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے۔

کرداروں میں فعّال کردار عرفان ہے۔کچھ حد تک احسان کا کردار بھی حرکی ہے۔نیّر، شمیمہ، نسیمہ اور ناظمہ میں نسیمہ جہاں تدبر رکھتی ہے، وہیں ناظمہ اپنی مکاری اور فتنہ پروی میں یکتا ہے۔نیّر اور اسکی ماں شمیمہ بڑے submissive کردار ہیں۔

چارنک کی کشتی

صدیق عالم کا یہ ناول ۴۳۴ر صفحات اور ۱۱ر ابواب پر مشتمل ہے۔'پیش لفظ' 'افتتاحیہ' آخری ضیافت' اور اختتامیہ کو چھوڑ کر ۷ر ابواب ہیں۔یہ سات ابواب سات اہم کرداروں پر بنائے گئے ہیں۔وہ سات اہم کردار یہ ہیں :

(۱) علی بابا (۲) چورنگی (۳) بابا پیڑ
(۴) گھڑی پال (۵) کلیسا (۶) بھٹا چارج
(۷) فادر ہرے رام

ناول کی کہانی انہی سات کرداروں کے گرد گھومتی اور آگے بڑھتی ہے۔ویسے اس ناول میں تقریباً ۲۹ کردار ہیں۔ان ۷ کرداروں کو چھوڑ کر باقی ضمنی کردار ہیں۔

پیش لفظ میں ناول نگار نے، ناول کے ضبط تحریر میں لانے کی وجہ مختصراً یہ بتائی ہے :

> ''۱۹۸۳ء کے ستمبر کا مہینہ، جب ایک گیلی شام میں بس سے شہید مینار کے سامنے اترا، میرے سامنے روشنی اور تاریکی (روشنی کم، تاریکی زیادہ) کا ایک سیلاب تھا۔میں بھی ہزاروں افراد کی طرح جو ہر روز کلکتہ آتے ہیں، اس سیلاب میں سما گیا۔وہ دن اور آج کا دن، میں آج بھی اپنی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔اسی جستجو کا ایک حصّہ یہ ناول (ہے) اسے میں نے ۱۹۹۵ء کے جون

میں لکھنا شروع کیا اور مارچ ۱۹۹۸ء تک یہ اپنے اختتام تک پہنچ گیا۔ ابھی میں اس پر نظر ثانی شروع بھی نہ کر پایا تھا کہ ۲۲/اپریل کی منحوس صبح میری شریک حیات میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ اور میں اپنے دو بچوں کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ ایک سال کا یہ ناول جو نثری نظم کی شکل میں لکھا گیا تھا کتابوں اور ڈائریوں کی بھیڑ میں گم رہا۔ مجھے اپنی خاموشی سے نکلنے کیلئے اتنا ہی وقت لگا۔ لیکن ابھی میں اس تاریک سرنگ سے نکل پایا تھا کہ ایک لمبی علالت کا شکار ہو گیا.....ایسے وقت میں جب کلکتہ کی بھیڑ بھاڑ سے الگ میں اپنے گوشے میں خاموش زندگی گذار رہا تھا اور زیادہ تر اپنی تنگ بالکنی پر بیٹھا بادام اور کدم کے پیڑوں کے پیچھے کلکتہ کے اسکائی لائن کے اوپر بادلوں، پرندوں یا طیاروں کو گذرتے دیکھتے رہتا، میں نے محسوس کیا جیسے کلکتہ دھیرے دھیرے میرے زخم پر پھاہا رکھتا جا رہا تھا۔ میں نے ناول کی نظر ثانی شروع کی اور اسکے صفحات سے گذرتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوا، میں اپنے زخموں کے ساتھ اکیلا انسان نہیں ہوں۔ اس کرۂ ارض پر بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے رہیں گے، بڑے بڑے حادثات پیش آتے رہیں گے، آسمان کے برجوں میں تارے اپنے اپنے مقامات بدلتے رہیں گے، مگر گھنٹیاں اپنے شہتیروں سے معلّق بجتی رہیں گی۔ کلکتہ دائمی ہے، اس کی موت کی پیش گوئی کرنے والوں نے شاید زندگی کا مفہوم سمجھا ہی نہ ہو۔''

مذکورہ اقتباس سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں، وہ یوں ہیں :

(۱) ناول نگار جب ۱۹۸۳ء میں کلکتہ آیا تھا اور لوگوں کے اژدھام میں گم ہو گیا تھا، وہ آج تک خود کو تلاش کرنے میں مصروف ہے اور یہ ناول اسی تلاش کا ایک حصّہ ہے۔

(۲) ناول نگار گوشہ نشینی پسند کرتا ہے، اسکے باوجود وہ شہر کلکتہ کا عاشق ہے۔

(۳) ناول نگار اپنے ذاتی غم کو جب اجتماعی غم کے تناظر میں دیکھتا ہے تو اس کے زخم بھرنے لگتے ہیں۔

(۴) دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے باوجود یہ شہر کلکتہ قائم و دائم ہے اور جو لوگ اسکی موت کی پیش گوئی کرتے ہیں وہ دراصل زندگی کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہیں۔

ان نکات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ناول نگار نے کلکتہ کو اپنے ناول کا موضوع کس حیثیت سے بنایا ہے اور کلکتہ سے اس کا رشتہ کتنا گہرا اور اٹوٹ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے کلکتہ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے، اور اپنے ذاتی غم اور کلکتہ کے کروڑوں انسانوں کے غم سے ہم آہنگ کر کے ناول کی تخلیق کی ہے۔

اس کے بعد چار صفحات پر 'افتتاحیہ' ہے، جس میں کلکتہ کی پیدائش اور اسے بسانے والے چارنک کی مختصر روئداد ہے۔ جس میں یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ ایک مستولی جہاز سے ایک بھاری پیتل کی گھنٹی کو ''ننگے بدن'' دیسی مزدور چھوٹی ناؤ پر اتار رہے ہیں۔ وہ گھنٹی اتنی بھاری ہے کہ اگر ''غلط زاوئے'' سے رکھا جائے تو ناؤ کے ڈوب جانے کا احتمال ہے۔

چارنک اپنے کچے مکان سے دور بھاگرتی ندی کے کنارے اپنی چارپائی پر ایک بھاری مسند پر تاڑی کے نشے میں چور بیٹھا ہے۔ اسکے دیسی نوکر اسے حقہ کی نَے پیش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بیوی ماریا، جسے اس نے ستی ہونے سے بچایا تھا، مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ مٹی اور لکڑی سے بنا ہمارا گرجا گھر کب اتنا مضبوط ہوگا کہ ولکنس کی تیار کردہ اس گھنٹی کا بوجھ سنبھال سکے گا۔ پھر بھی تم یرمیا سے کہہ دو کہ وہ اسے مضبوطی سے باندھ کر لٹکا دے اور زور زور سے بجائے، اور یہ اعلان کر دے کہ صرف ہندوستان کی مختلف قومیں ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری قومیں بھی یہاں آئیں اور اپنے طور پر اس شہر کو بسائیں۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جب چرچ کی گھنٹی کی آواز دور دریا میں کشتیوں تک پہنچی تو آواز سن کر پرندے تک خوفزدہ ہو رہے تھے۔ چارنک مرغی کی قربانی دیکر اور پانچ پیر پر چڑھاوا چڑھا کر سوتانوٹی گھاٹ پر تاڑی کے نشے میں چور کشتیوں سے سامان، جن میں تیل، شکر، ساٹن، نباتات، لاکھ چینی کے برتن، ڈھاکا کی ململ اور آسام سے درآمد کئے گئے ہاتھی دانت تھے، جنہیں وہ اترتے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے قریب کے گھاٹ پر جوڑا بگان کے سیٹھ اور بساک اپنی نگرانی میں سوت

کے گھٹوں کو کشتیوں سے اتروا رہے تھے جن کو لے جانے کیلئے چیت پور کے بنکر قطار باندھے کھڑے تھے۔عوام کا ایک طبقہ افیون کے نشے میں دھت یہاں وہاں پڑا تھا۔

ٹھیک اسی وقت ستگاؤں کا ایک پرتگالی پادری اپنے سینے پر کراس کا نشان بنائے اپنی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر اداس بیٹھا تھا۔اسلئے کہ وہ کلکتہ کو ایک غلاظت میں ڈوبا اور موت کے قریب دیکھ رہا تھا۔اس کی نظر میں یہاں کے رہنے والے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی آگ میں جل رہے تھے،اور شاید جلتے رہنا خدا نے اس کا مقدر بنا دیا تھا۔

اس افتتاحیہ کے بعد کرداروں کے نام سے باب شروع ہوتا ہے۔ پہلا باب ''علی بابا'' کے نام سے ہے جو تقریباً ۳۷ رصفحات پر مشتمل ہے،جس میں ''علی بابا'' کا کردار کچھ یوں ابھرتا ہے۔

علی بابا

علی بابا جس کا اصل نام فیاض علی ہے، ہندوستان کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔وہ اپنے گاؤں سے کلکتہ اس وقت آتا ہے جب سیلاب سے اس کے کھیت، گھر سب تباہ ہو جاتے ہیں۔اسے کھال کنارے بنے ہوئے غیر قانونی جھونپڑیوں میں سے ایک جھونپڑی میں تنہا رہنے والا،جس کو لوگ بوڑھا ایرانی کے نام سے جانتے تھے، پناہ دیتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اسکے لئے بھی دو وقت کی روٹی کا انتظام کر دیگا۔علی بابا کو چائنس رستوران کے مالک سمسن نے اپنے یہاں نوکری دی، جہاں اسکی ملاقات ایک مفلوک الحال گاہک بھٹا چارجی سے ہوتی ہے۔سمسن جہاں علی بابا کو عیسائی بنانا چاہتا ہے، وہیں بھٹا چارجی اسے سونا گاچھی (جسم فروش عورتوں کا علاقہ) کا راستہ دکھاتا ہے۔بوڑھا ایرانی اس وقت بہت خوش ہو کر علی بابا کو دعائیں دیتا ہے جب وہ ہوٹل کے بچے کھچے کھانے لا کر اسے کھلاتا ہے۔لیکن اس بات کی تاکید ضرور کرتا کہ سور کا گوشت اسے کبھی بھی دھوکے سے مت کھلانا،نہیں تو وہ دنیا میں تکلیف دہ زندگی بسر کرنے کے علاوہ قبر میں بھی سکون سے نہیں رہ پائے گا۔اس نے بھی سمسن سے کہہ دیا تھا کہ اگر کبھی میں مذہب تبدیل بھی کروں تو مجھے سور کے گوشت کھانے پر مجبور مت کرنا۔علی بابا، بھٹا چارجی کو شراب پلاتا اور نشہ چڑھ جانے کی صورت میں بھٹا چارجی اسے ''ہندی نما بنگالی'' گالیوں سے نوازتا لیکن وہ سنی ان سنی کر دیتا۔اس چائنس ریستوران میں دوسرے پینے والوں میں زیادہ تر سیاح ہوتے جو اپنے لمبے لمبے بالوں اور ہستیوں سے اپنی زندگی سے عاجز نظر آتے ہیں۔

چورنگی

یہ باب ۵۳ رصفحات پر مشتمل ہے۔اس باب کی کہانی درج ذیل کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ (۱) مادام سین سناتی (۲) چورنگی (۳) مقیم (۴) ہیرا (۵) نگرچی (۶) سیٹھ کشل چھنگوانی (۷) پائرن (۸) سمر (۹) کلیسا اور (۱۰) بھٹا چارجی۔(جس کا ذکر پہلے باب میں بھی آیا ہے) اِن کرداروں کا اس باب میں ایک طرح سے تعارف کرایا گیا ہے۔

مادام سین سناتی جو ''بلا کی گوری، بلا کی بوڑھی اور بلا کی ناٹی میم ہے''۔اس کا انگریز شوہر نیویارک میں جا کر بس گیا ہے وہ ہر سال کرسمس، نئے سال اور شادی کی سالگرہ میں اپنے پسندیدہ نوادرات بھیج دیا کرتا ہے۔جب کہ چار سال قبل مادام سین سناتی کا انتقال ہو گیا ہے اور جسے پارک اسٹریٹ کے پرانے قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہے۔مادام سین سناتی اِن یتیم بچوں (چورنگی، مقیم، ہیرا اور نگرچی) کیلئے چرچ سے پرانے کپڑے اور کھانے کا سامان لا کر دیا کرتی تھی۔وہ ایک بوسیدہ عمارت میں رہتی تھی۔جس کی اندھیری سیڑھیوں پر ان یتیم اور لاوارث بچوں کا موسم سرما میں گھر ہوتا۔اس عمارت میں دھندہ کرنے والیاں بھی رہتی تھیں، جہاں اکثر پولیس کا ریڈ بھی ہوتا ہے۔ایک بار برسات کی کالی اندھیری رات کو پولیس نے ریڈ کیا، اور ان بچوں کو بھی تفتیش کے بہانے اٹھا لے گئے، تھانے میں ان بچوں کے ساتھ اغلام بازی کی اور ان کو زخمی کر کے چھوڑ دیا۔اس وقت مادام نے اُن کے آنسو پونچھے تھے۔لیکن اب مادام کے گزر جانے کے بعد وہ سب جرائم کی دنیا میں داخل ہو گئے تھے کہ انہیں زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور پیٹ بھی بھرنا تھا۔ان کی مجرمانہ سرگرمیاں مرکزی کلکتے کے چورنگی علاقہ، میدان اور اس کے اطراف میں ہوا کرتیں۔ یہاں وہ ہر وہ کام کرتے جسے مذہب اور سماج میں ناپسندیدہ اور جرم سمجھا جاتا ہے۔میدان کے علاقے میں ہی چورنگی کا سامنا کلیسا سے ہوتا ہے۔اس لڑکی کا نام کلیسا اس لئے پڑا کہ وہ سینٹ تھامس چرچ کے فٹ پاتھ پر پلی اور بڑھی ہے۔کلیسا چورنگی سے پیار کرنے لگتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔کلیسا کہتی ہے :

''مگر یاد رکھنا ابھی تک تمہاری کلیسا ہے کنواری
میں وعدہ کرتی ہوں، کروں گی میں جتن
بچا کر رکھنا ہے مجھے تمہارے لئے اپنا انمول رتن
چورنگی کا بھی وعدہ ہے
چاہے وہ بن جائے ایران کا شہزادہ
رہے گا تمہارا وفادار''

اس کے علاوہ اس باب میں مونومنٹ کے چبوترے پر کالج کا نیم پاگل، خستہ حال پروفیسر اپنی کرم خوردہ کتابوں کے بنڈل کو اپنے سرہانے رکھے پڑا موت کا انتظار کرتا ہے۔ وہیں نگر جی، جو ڈرگس کا دھندہ کرتا تھا، کا گلا جب کسی نے کاٹ کر مار ڈالا تھا اور اسکی لاش سنٹرل ایونیو کے مردہ گھر میں پڑی سڑ رہی تھی۔ اس وقت اس کے ان فٹ پاتھی ساتھیوں، جن میں بہاری، پربھو دیال، نجو اور افغان، مقیم، چورنگی، ہیرا اور لنگڑا بھکاری پاسوان نے چندہ کر کے اس کی لاش کو رشوت دے کر اور رشتہ دار بن کر حاصل کیا اور اسے ٹھکانے لگایا۔ جب کہ نگر جی کی منہ بولی ماں، شبراتن جو اسے کوڑے دان سے اٹھا کر لائی تھی، نے اس کی لاش لانے سے انکار کر دیا تھا۔

بابا پیٹر

اس باب کے مطالعے سے حسب ذیل کردار سامنے آتے ہیں، جو ضمنی ہیں لیکن کہانی کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں :

(۱) ماما (۲) نارمن بیری
(۳) پاپا جان ایسٹ مین (۴) لالن شیخ عرف نابینا قوّال
(۵) ایلین (ماما کی بیٹی) (۶) فادر گریگوری دانیال
(۷) زیوس (۸) جوسف جیکب
(۹) پیٹر (۱۰) بونے انتھونی انکل عرف شہید پاشا
(۱۱) مظلوم شاعر عزیز مونگیری (۱۲) جیکب
(۱۳) اپاہج گجندر بھٹیا (۱۴) انکل سانتیا گو

اس باب میں ایک انگلو انڈین فیملی کی بڑی دردناک اور پُر اثر کہانی ہے، جو یوں ہے:

بابا پیٹر جان مرکزی کلکتہ کے ایلیٹ روڈ کے ایک بوسیدہ فلیٹ کی دوسری منزل میں رہتا ہے۔ وہ دراز قد، دبلا پتلا اور نحیف تھا۔ اسکے باوجود وکٹوریہ میموریل کے قریب کیتھیڈرل چرچ میں جھاڑ پونچھ کا کام انجام دیتا ہے اور وہاں سے جو ملتا ہے اس سے اسکی فیملی کی بسر اوقات ہوتی ہے۔ لیکن اپنی کمائی کا ایک چوتھائی حصّہ شراب کی نذر بھی کر دیتا ہے جب پیسے کی کمی ہوتی تو وہ فادر گریگوری دانیال سے الجھتا کہ میری تنخواہ بڑھاؤ۔ جان کی بیوی ہلڈی دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ بابا پیٹر جان نے اپنے گھر رنگ برنگ کی چڑیوں کو بھی پال رکھا ہے۔ جنھیں وہ مختلف موقعوں اور مختلف جگہوں سے زخمی حالت میں اٹھا لایا تھا، ان کا علاج کر کے اور تندرست کر کے اپنے گھر پال رکھا تھا۔ ہلڈی اور جان کا ایک لڑکا (جونیر پیٹر) اور ایک لڑکی ایلین تھی۔ ایلین بڑی تھی اور اسکا اصلی باپ انکل سانتیا گو تھا جو اُس وقت ماما ہلڈی کو چھوڑ کر آسٹریلیا چلا گیا تھا جب ایلین پیٹ میں تھی۔ بابا پیٹر نے بعد میں اس سے شادی کر لی تھی۔

بابا پیٹر نے ہلڈی کو بڑے جتن سے رکھا تھا۔ اسے وہ کسی قسم کی تکلیف نہیں دیتا تھا۔ لیکن جب اس پر فالج کا حملہ ہوا، تو اسی دوران مسٹر سانتیا گو آسٹریلیا سے کلکتہ آ گئے اور ہلڈی کو علاج کیلئے نرسنگ ہوم میں داخل کیا۔ بلکہ وہ یہ چاہتا تھا اگر تھوڑی بھی حالت سدھر جائے تو اسے آسٹریلیا لے جائے گا۔ لیکن بابا پیٹر، جان اور ہلڈی نہیں چاہتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ بہر کیف، مسٹر سانتیا گو کے سامنے ہی ہلڈی کی روح پرواز کر گئی اور اسکے بعد مسٹر سانتیا گو آسٹریلیا واپس چلے گئے۔ اِدھر ایلین بری صحبت میں پڑ کر ایک رات گرفتار ہو گئی، جسے بابا پیٹر تھانے سے چھڑا لائے۔ اس واقعے کا اثر بابا پیٹر پر بہت بُرا پڑا اور اس

نے اپنے کمرے کے سلینگ فین سے جھول کر خودکشی کر لی۔اب ایلن اور جونیر پیٹر ہی رہ گئے لیکن ایک دن ایلن بھی راہ فرار اختیار کر گئی اور جونیر پیٹر اکیلا رہ گیا۔

گھڑی پال

اس باب کے ابتدائی حصّے میں ناول نگار نے ذیل کے کرداروں اوران کی مصروفیات کا تعارف کرایا ہے جو یوں ہے :

(۱) گھڑی پال دھنباد میں کوئلہ چرانے کا کام کرتا تھا۔لیکن جب وہاں زمین دھنسنے لگی تو اپنے بیوی بچوں کو گاؤں بھیج کر خود قسمت آزمائی کیلئے کلکتہ چلا آیا اور گرانڈ ہوٹل کے فٹ پاتھ پر بوڑھے بھکاری سے اسکی جگہ قیمتاً خرید لی۔اسکی پانچ بن بیاہی لڑکیاں ہیں۔

(۲) یہاں اسکی ملاقات بلدیو سے ہوتی ہے جو کوبرا کا تیل بیچتا ہے لیکن جو چنی لال دھوبی کی رکھیل ہے۔

(۳) گنگا دھر جو ہٹا کٹا مزدور ہے اور بو بازار کے فرنیچر کی دوکانوں سے بکے ہوئے فرنیچر کو خریداروں کے گھر پہونچاتا ہے اور پاس کی بدنام گلی میں گرجا ماسی کا دل بہلاتا ہے۔

(۴) رام جی پرساد جو ہر فٹ بال گرانڈ میں کرکرے چنا بیچتا ہے۔

(۵) گنجا رام سنگھ جو ہاوڑہ پل کے نیچے، پوجا کے باسی پھول بیچتا ہے اور نوآموزوں کو پہلوانی کا درس دیتا ہے۔گنگا کی مٹی سے بدن کی مالش کرتا ہے اور اس کا اکھاڑا وہاں بہت مشہور ہے۔

(۶) تاراچند گپتا جو سٹّہ کا کاروبار کرتا ہے۔ایک روز جیل جاتا ہے اور پھر کسی سٹّہ ڈان کی مدد سے باہر آجاتا ہے۔

(۷) جھبو عرف جھبو ناتھ جو ایک مدراسی ہوٹل میں میز صاف کرنے کا کام کرتا ہے۔

(۸) من سُکھ لال جو ایک مرچا سیٹھ کا دلال ہے۔

مذکورہ کرداروں کے مشترکہ ڈیرے میں شامل ہوتے ہیں۔

(۱) کانسٹبل مکتا رام جس کی مہربانی اور مدد سے یہ افراد فٹ پاتھ پر ڈیرا جمائے ہوئے تھے، کو کبھی کھبار بھنگ کا کش آ کر لگا جایا کرتا۔

(۲) پرویت ہری شنکر پنڈا، جو ناگ بابا کے مندر سے نکالا گیا تھا، لیکن بھنگ سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔

ان کرداروں کے تعارف کے بعد کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ ہگلی ندی کے کنارے شیومندر گھاٹ پر رام سنگھ اپنے چیلوں سے کشتی لڑوا رہا ہے اور پان سے بھرے منہ سے گالی دے کر انہیں داؤ پیچ بتا رہا ہے۔

گھڑی پال اور من سکھ گھاٹ کی گیلی سیڑھی پر بیٹھے ہاوڑہ پل کو دیکھ رہے ہیں۔جس پر سے لوگوں کا اژدھام گذر رہا ہے۔سامنے کشتیوں پر سوار ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہیں۔دریا میں اِدھر سے اُدھر اسٹیمر بھاگ رہے ہیں۔من سکھ بول اٹھتا ہے کہ ہمارے دشمن ہمارے سینے پر بیٹھ کر ہمارا اناج کھائیں، یہ غم کب تک سہنا ہوگا۔من سکھ لال کا مالک پرشوتم اگروال، جو مرچوں کا بازار کرتا ہے، اتنا موٹا ہے کہ اسکی موت پر سندل کی لکڑی کے ساتھ گھی کی ضرورت نہیں پڑے گی، کیونکہ اس کے بدن کی چربی ہی کافی ہے۔

اس کے بعد ناول نگار راوی بن کر ہندو Mythology کے حوالے سے یہ کہتا ہے کہ وشنو نے اپنی جٹا میں گنگا کو روکے رکھا ہے، ورنہ یہ پورا شہر ڈوب جاتا۔جیسے کلکتہ کے اس گھاٹ میں خود وشنو بھگوان کیچوے کا روپ دھار کر کے سمندر منتھن کر رہے ہوں۔لیکن اس سمندر منتھن سے جو جھاگ اٹھتا ہے، اس کا زہر پینے والا کوئی نیل کنٹھ نہیں ہے۔اب تو خود انسان کو ہی اپنے حصّے کا زہر چکھنا ہوگا۔کیونکہ اس شہر (کلکتہ) کا اپدیش ہے، یہی اس کا وردان ہے۔

گرانڈ ہوٹل کے نیچے جب گھڑی پال کے وزن کرنے والی مشین پر گورے چڑھتے اور کاربوہائیڈ کی روشنی میں اپنا وزن دیکھتے تو اسے دو سے پانچ تک کی رقم مل جاتی۔جبکہ بنگالی جوڑے اپنے بچے کو چڑھاتے تو نصیحتوں کی بوچھار کر دیتے۔شام کی آمد کے ساتھ چورنگی میں چہل پہل بڑھ جاتی۔فرضی نام رکھنے والی رنڈیاں نمودار ہو جاتیں۔لیکن گھڑی پال اپنی ضرورت پوری کرنے کیلئے چونا گلی کی مردولا کے پاس جاتا۔کانسٹبل مکتا رام کا کہنا تھا کہ اگر یہ بدنام اور گندے محلے نہیں ہوتے تو شریف بہو، بیٹیوں کا باہر نکلنا مشکل ہو جاتا۔انہی پیشہ کرانے والی عورتوں کی وجہ سے شہر میں امن وامان ہے۔اور پھر مختلف مذہب کے طرح طرح کے سامان بیچنے والے افراد کا جمگھٹا لگ جاتا۔جب رات آتی اور آسمان میں تارے بکھر جاتے تو گھڑی پال کی اجتماعی ہانڈی میں آلو اور بھات پکنے لگتا۔اس وقت رام جی پرساد دیکھتا کہ ان لوگوں سے تھوڑی دوری پر ہری شنکر برگد کے پیڑ سے ٹیک لگائے اکیلا بیٹھا ہے تو اسکے قریب جا کر اُسے سب میں شامل ہونے کی دعوت

دیتا اور کہتا کہ تیرے دل کی تکلیف کا علاج بھی انھیں لوگوں کے پاس ہے۔اس پر ہری شنکر مستعد ہو کر کہتا کہ :

''ہردے روگ کیلئے کس کے پاس سمٹے ہے یہاں
میرے ہردے میں جاگرت ہے تری مورتی کا سمان
پرنتو کبھی کبھی میں سوچتا ہوں بچلت ہو کر
سرشٹی کیلئے برہما نڈ نے کیوں رچا یا دھرم چکر
جانے کیوں منشیہ کو ملا ہے جیون دان
جب کہ مرنے کے بعد ڈنڈ کے ہیں اٹھائیس استھان
استری بنے کیوں بیہولا منش کیوں ڈھونڈے چنتا منی
منشیہ تو اپنے منشیہ میں آپ ہے بلا کا دھنی
اچھا ہوتا جو برہما جی کی کبھی نہ ٹوٹتی نیند
ہم سرشٹی کے انتم کھنوں تک
اپنی کا پاؤں کے ساتھ نہ متھے جاتے
نہ ہم رام جی پرساد کو جاتے
نہ رام جی پرساد ہمارے روبرو ہوتے۔''

(یہ پورا مکالمہ سنسکرت آمیز ہندی میں کردار کی مناسبت سے دیا گیا ہے۔مگر آخر میں ''روبرو'' کا پیوند لگتا ہے۔ساتھ ہی ''شنوں'' کی جگہ ''کھنوں'' محلِ نظر ہے)

گنگا دھر، ہری شنکر کی یہ باتیں سن کر اعتراف کرتا ہے کہ وہ یہ گیان کی باتیں نہیں سمجھتا، وہ صرف یہ جانتا ہے کہ جب تک اسکی زندگی کا سورج غروب نہ ہو، وہ زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور بھگوان نے اسے دو کان دئے ہیں تا کہ وہ سب کچھ سنے اور نکال دے۔گنگا دھر کے متعلق گھڑی پال کہتا ہے کہ وہ جو بازار کی ایک عورت کا داشتہ بن بیٹھا ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں وہاں چلا جائے گا۔جب سب کا کھانا پینا ہو گیا اور رات گہری ہونے لگی، چاند کی روشنی پوری طرح پھیل گئی تو من سکھ لال دیوار سے ٹیک لگا کر کہتا ہے :

''جب میں سوچتا ہوں تو مجھے آتی ہے ابکائی
برہما نے ایک ساتھ کیا گؤ اور برہمن کی سرشٹی
مگر ٹینگڑا کا جا کر دیکھو کیل خانہ
گؤ ماتا کس طرح ہوتی ہے ہتیا
یہ محض ہے سیدھے سادے ہندوؤں کو چھیڑنے کا بہانہ
میری بھاشا کی سختی کیلئے مجھے کر دو معاف
مگر جس طرح رام چندر جی نے کہا تھا
راکششوں اور دانبوں سے
وندھیا کے جنگلوں کو صاف
اٹھے ہندو جاتی ہو جائے تیار
اٹھاؤ سب جئے شری رام کی تکرار''

(فٹ پاٹ پر رہنے والوں کے اندر بھی مذہبی عصبیت اور جذباتیت کس قدر ہے، اسکے علاوہ ان لوگوں کے اندر، خصوصاً من سکھ لال کے اندر سیاسی شعور کتنا ہے، اس کا اندازہ اس باب میں ہوتا ہے۔ اسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ جب پاکستان ایٹمی ہتھیار بنالے گا تو بھارت کا وجود ختم کردے گا۔)

صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو یہ پتا چلتا ہے کہ گھڑی پال کے وزن کرنے والی مشین چوری ہوگئی ہے۔ پتہ چلا کہ ڈیرے سے جھبّو لال غائب ہے۔ گنگا دھر اسے تلاش کرنے نکلا اور سہ پہر تک اسے ڈھونڈ نکالا۔ معلوم یہ ہوا کہ اس نے جان بازار کے سکندر یادب عرف بروک بونڈ کے بہکانے پر اس نے مشین چرائی تھی اور سو روپئے سکندر سے اسکے بدلے میں لئے تھے۔ اب سکندر یادب تین سو مانگتا ہے۔ آخر سبھوں نے چندہ کر کے سکندر یادب کو دیا اور جھبّو کی سزا گنگا دھر نے یہ ٹھہرائی کہ اسکے ساتھ منہ کالا کیا۔ رات ہوتے ہوتے جھبّو پھر غائب ہوگیا، اور کبھی واپس نہیں آیا۔ اسکے غائب ہونے کی پروا کسی کو نہ تھی، سوائے گنگا دھر کے۔ وہ سر پھرا اسے ڈھونڈتا پھرا۔ اسی دوران سورج رام ڈیرے میں آیا۔ سورج رام الٹا ڈانگہ کے موڑ پر آئس کریم کی چمچی اور تیلی بنانے کی فیکٹری میں دربانی کرتا ہے اور اپنی آنکھوں پر موٹی عینک لگائے بنارس اکثر خط لکھا کرتا ہے جس کا جواب اسے کبھی نہیں آیا۔ وہ جس عمارت میں دربانی کرتا تھا اسے کسی غیر ملکی کمپنی نے خرید لیا تھا اور اسے توڑ کر نئی تعمیرات کروا رہا تھا۔ پرانے کرایہ داروں اور دکانداروں کو پولیس نے سیاسی پارٹی کے طاقتور افراد اور غنڈوں کی مدد سے نکال کر قبضہ کرلیا تھا۔ جھبّو کے غائب ہونے کے بعد گھڑی پال اپنی مشین کو محفوظ مقام پر رکھنے کیلئے پریشان تھا۔ آخر کار صدر اسٹریٹ کے پرانے گرجا گھر کے دربان مائکل یادب کے کمرے میں جگہ ملی۔ چرچ کے فادر ہرے رام بڑے دلچسپ انسان ہیں۔ انھوں نے اس شرط پر سامان رکھنے کی اجازت دے دی کہ اس کو فادر کے ساتھ مدر ٹریسا کی دعوت میں شریک ہونا ہوگا۔ پھر رفتہ رفتہ گھڑی پال، چرچ، اسکول اور ہرے رام کے رہائشی بنگلہ سے قریب اور اپنے ڈیرے سے دور ہوتا چلا گیا۔ بابا پیڑ پہلی بار چورنگی کے قریب جادو گھر کے پھاٹک کے جنگلہ کے قریب دکھائی دیا۔ وہ وہاں موجود بدیشی نشہ خوروں کے ساتھ تھا۔ گھڑی پال کو عیسائیت سے قریب ہوتے دیکھ کر اسے ہندو دھرم یاد دلایا۔ اور اسے اتتؔ وید، بال چند اور گرمیت رام سے ملایا اور ہندو جاتی کیلئے کچھ کرنے کی تلقین کی اور ایودھیا جا کر بابری مسجد، بقول اسکے، کے متنازعہ ڈھانچہ کو گرانے کیلئے کارسیوکوں میں شامل ہونے پر آمادہ کیا۔ کارسیوکوں کے ساتھ ایودھیا جانے سے قبل وہ اپنا گاؤں گیا اور آرتیؔ (بیوی) اور اپنے سات بچوں سے آخری بار ملنے گیا۔ لیکن دمہ کی مریض بیوی اور اپنے بچوں کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ وہ اگر چلا گیا اور ''شہید'' ہوگیا تو ان لوگوں کا کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس نے جانے کا ارادہ ترک کردیا اور گاؤں میں ہی رہ گیا۔ لیکن ان سات کارسیوکوں کا جتھہ جو اس کے گاؤں سے گیا تھا، مسجد توڑ کر لوٹا تو گاؤں میں ان لوگوں کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ چوپال کو سجایا گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے مٹھائی بانٹی۔ بھاشن دیئے گئے اور جے شری رام کے نعرے لگائے گئے اور ان لوگوں پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ ساتھ ہی ان کارسیوکوں میں جو مسجد کے ٹکڑے اٹھالے آئے تھے، ان کی نمائش کی گئی۔ اسی دوران بوڑھے شیو چرن اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے اور کہا کہ خوب تو ان ساتوں کو سمّان دیا جارہا ہے۔ مگر ان کا اصلی روپ کون جانتا ہے؟ یہ لوگ اجودھیا تو گئے تھے مگر کیا ضروری تھا کہ اس ہریجن عورت کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے آئے۔ یہ سنتے ہی دیوقامت دھنا لال اور بھاک سنگھ، دونوں نے اپنی دفاع میں کہا کہ جو بہادر میدان جنگ میں جاتے ہیں ان کے ہاتھ جو لگتا ہے، اسے اٹھالاتے ہیں۔ اچھا ہوگا کہ ہمارے معاملے میں کوئی نہ بولے۔ اس طرح ہم نے گاؤں کی ناک اونچی کی ہے۔ ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ کوئی تاک جھانک کرے۔ اس رات گاؤں میں ایک مسلسل خاموشی چھائی تھی اور کہاسے نے پورے گاؤں کو اندھیرے میں ڈھک لیا تھا۔ ''مگر اپنے پاپ سے سہما ہوا اپنا گاؤں''۔

پھر گھڑی پال اپنے گاؤں کا حال سناتا ہے کہ اسکے بعد اسے فساد کی خبر ملی کہ چاروں طرف فساد پھیل گیا ہے اور فوجی گاڑی گاؤں کی کچی سڑک سے ہو کر گزر رہی ہے۔

جب گھڑی پال کلکتہ واپس آیا تو اسے سب کچھ بدلا بدلا ہوا محسوس ہوا۔ پھر فادر ہرے رام نے اسے ڈیز پر بلایا اور وہاں اسے بابا پیڑ سے ملاقات کروائی۔ اس طرح وہ دونوں گہرے دوست بن گئے۔ اسی دوران کلکتہ میں بھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح فساد پھوٹ پڑا اور گھڑی پال اپنے جذباتی اور مذہبی جنون کے شکار دوستوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور گر کر زخمی ہوگیا۔ اسے بابا پیڑ اپنے گھر اٹھالایا اور اسکے زخموں کا علاج کیا، تین دن اور دو رات اپنے گھر رکھا۔ فساد کی وجہ سے شہر کا کاروبار بالکل ٹھپ پڑ گیا تھا اور گھڑی پال کے وہ بزدل دوست، جنھوں نے فساد میں حصّہ لیا تھا، پکڑ دھکڑ کے ڈر سے گاؤں چلے گئے۔ گھڑی پال میدان کے علاقے میں یوں ہی اِدھر اُدھر پھر رہا تھا کہ دیکھا کہ اُس برگد کے درخت سے پرویت ہری شنکر نے جھول کر خودکشی کرلی جسکے نیچے پتھر شیولنگ کی وہ پوجا کرتا تھا۔

کلیسا

اس باب میں بنگال کے ایک گاؤں، جو کلکتہ سے قریب کہیں ہے اور جس کا نام دریا پور ہے، اور جس گاؤں کی رہنے والی کلیسا ہے، کی کہانی ہے۔ کلیسا جسے سنّی میاں ایک گرجا گھر سے اٹھالائے تھے۔ ان کی پہلی بیوی نے اس کا نام گرجا گھر کی مناسبت سے کلیسا رکھ دیا تھا۔ اپنی پہلی بیوی کی موت کے بعد سنّی میاں نے لکھاتی بیگم سے شادی کر لی تھی۔ مکھانی بیگم جوان ہے اور بقول اس کے عاشق نجرل ''اس کا جسم وہ استھان ہے کہ اس میں جنم جنمانتر کیلئے ڈوب جائے انسان۔'' وہ دونوں مکھانی بیگم اور نجرل اس بات کے منتظر ہیں کہ کب سنّی میاں کی موت واقع ہو اور کب وہ دونوں آزادانہ دادِعیش لے سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ کلیسا پورے طور پر جوان ہو جائے تو اس کو بیچ کر اچھی خاصی رقم کمائے۔ چونکہ دریا پور گاؤں کے کنارے واقع تھا، اسلئے کلیسا اکثر کنارے لگتی کشتی پر سے اترتے مسافروں کو دیکھتی۔ ایک بار کشتی سے اترتے ہوئے ایک مذہبی جماعت کے سربراہ حاجی قطب الدین کاظمی نے کلیسا کو دیکھا اور فریفتہ ہو گئے اور اسے اپنے نکاح میں لینے کیلئے سنّی میاں سے سودا کر لیا۔ حاجی کاظمی پیشہ سے پارچہ فروش تھے اور سنّی میاں کو نوٹوں کی گڈی پیشگی کے طور پر دے کر یہ کہا کہ تین ہزار مزید وہ اسے دے گا جب وہ اسکے نکاح میں آجائے گی۔ بس، اس کے پہلے حیض کے ایک ماہ کے اندر تک اسکی حفاظت کرنی ہے اور اس کا نام کلیسا سے بدل کر تسمینہ بی بی رکھ دینا ہوگا۔ مکھانی بیگم یہ سن کر سنّی میاں سے کہتی ہے کہ وہ دس ہزار روپئے اس کے لئے دینے کو تیار ہے۔ یہ سن کر سنّی میاں، مکھانی بیگم سے کہتا ہے اگر تم تیار ہو جاؤ تو ملا نا کاظمی سے اور بھی مال اینٹھا جا سکتا ہے۔ اسی دوران سنّی میاں کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور اسے کلکتہ کے پی۔ جی۔ اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ایک ماہ تک وہ وہاں زیرِ علاج رہا۔ گھر لوٹا تو دیکھا کہ مکھانی بیگم، دروازے پر بیٹھ کر حاجی قطب الدین کاظمی کے پاؤں میں تیل کی مالش کر رہی ہے۔ سنّی میاں کو دیکھ کر حاجی قطب الدین کاظمی نے کہا کہ اچھا ہوا تم آ گئے۔ اب کلیسا کی ٹھیک سے رکھوالی کرنا اور اسے مزید کچھ روپے دئے۔ اس دوران کلیسا کو سخت نگرانی میں رکھا گیا۔ ایک رات سنّی میاں نے چپکے سے مکھانی بیگم کا پیچھا کیا اور اسے نجرل کی کشتی میں داخل ہوتے دیکھا تو گھر لوٹ کر کلیسا کے ساتھ منہ کالا کرنا چاہا۔ کلیسا نے اپنی مدافعت میں اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ گر پڑا اور اسکے دل کی دھڑکن رک گئی۔ وہ مر گیا۔ نجرل نے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا اور عدّت کی مدت گزارنے کے بعد مکھانی کے ساتھ نکاح کر کے اسی کے ساتھ رہنے لگا اور اپنی بانجھ بیوی کو دریا پار چھوڑ آیا۔

مکھانی بیگم کے ساتھ رہنے کے بعد نجرل کلیسا کے ساتھ بھی دست درازی کرتا اور کلیسا بھی اب اسکی ان حرکتوں کی عادی ہو گئی تھی۔ اسلئے کہ نجرل اس کیلئے کپڑے اور سنگار کے سامان لا کر دیتا۔ اُدھر وہ قطب الدین کاظمی سے کلیسا کیلئے رقم اینٹھتا۔ پھر ایک رات نجرل نے کلیسا کو عبدالرب لشکر کے ساتھ سودا کرنے کیلئے اسکی کشتی میں بھیج دیا۔ اس طرح اس کا کنوارا جسم داغ دار ہو گیا۔ اِدھر قطب الدین کاظمی جو لکھنؤ گئے ہوئے تھے، لوٹ آئے اور ۹/ربیع الاول کو شادی کی تاریخ طے کی۔ اس دوران عبدالرب لشکر، کلیسا کو کلکتہ لے جا کر شیٹ محمد اور شیخ طوطا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔ پھر وہاں سے کلیسا ہر شام کرزن پارک میں لائی جاتی اور مختلف لوگوں سے اسکے جسم کو چھونے اور مسلنے کی قیمت وصولنے کیلئے عید محمد مامور رہتا۔ کلیسا اکثر آدھی رات کو اٹھ کر روتی مگر کیا کر سکتی تھی اور اسے ایسا محسوس ہوتا۔ ''جیسے کسی ہزار منہ سانپ نے اسے چنگل میں لے لیا ہو۔'' وہ ہار گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی اور اس کے اندر سے یہ امید بھی ختم ہو گئی تھی کہ وہ کبھی لوٹ کر دریا پور، اپنا گاؤں جا سکے گی۔

بھٹا چارج

بھٹا چارج کا دادا اکھیمل بھٹا چارج انگریزوں کے زمانے میں بہت بڑے وکیل تھے۔ جنکا ذاتی خیال یہ تھا کہ ہندوستان پر ہمیشہ ہی غیر ملکیوں نے حکومت کی ہے۔ ہمارے کسانوں کو دو وقت کی روٹی مل جائے، یہی بہت ہے۔ باقی تمام معاملات تو راجاؤں، نوابوں اور زمینداروں کے سوچنے کے ہیں، اسلئے بھٹا چارج کے دادا انگریزوں کے خیر خواہ تھے اور ان کی برکتوں کے گُن گاتے تھے۔ بھٹا چارج کے بیٹے بھی اپنے والد کی طرح قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن یونیورسٹی میں جب چھٹی ہوتی تو رانا گھاٹ کے مکان میں چلے جاتے۔ انہیں انگریزی شادی اور قدرتی مناظر بہت پسند تھے۔ ان کی شادی کب اور کس حال میں ہوئی، کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اکھیمل بھٹا چارج کا خیال تھا کہ وہ ان کے بیٹے کی انقلابی تقریر سے متاثر ہو کر مرشد آباد کی ایک لڑکی نے اس سے بیاہ رچا لیا تھا۔ جب بھٹا چارج ایک سال کا تھا، اسکے دادا اکھیمل بھٹا چارج مرشد آباد اپنے بیٹے کے گھر گئے، جہاں وہ گاؤں میں ٹیچر تھے۔ وہ بھٹا چارج کو کلکتہ لے آئے اور اپنی نگرانی میں اسکی پرورش کرنے لگے۔ کلکتہ ان دنوں تیزی سے بدل رہا تھا۔ وہ زمیندارانہ ٹھاٹ باٹ زوال پذیر تھا۔ سیاسی حالت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اکھیمل

بھٹا چارج سچ کی وجہ سے کبیدہ خاطر تھے۔اوراس کا اظہار وہ اپنے قریبی دوستوں امرائے پردھان، ہمادری بھوشن، تیرتھنکر، گنوموٹے چٹوپادھیائے وغیرہ سے اس وقت کرتے جب ان کی محفلیں جمتیں اور چائے حقّہ کے ساتھ ساتھ گرما گرم بحثیں بھی چلتیں۔جن میں ہندوستان کی تحریک آزادی موضوعِ بحث ہوتی۔ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس خوف ہوتا کہ انگریزی حکومت اورتحریک آزادی کی وجہ سے بدلتے ہوئے خیالات سے سناتن دھرم برباد ہوجائے گا۔ابھیمل بھٹا چارج کے بچپن کے دوست گنوموٹے چٹوپادھیائے اس بحث میں اکثر خودشریک نہیں ہوتے اور خاموشی سے سنتے۔مگر جب انہیں ایک بار ٹھونکا لگایا گیا تو انھوں نے بڑے پتے کی بات کہی کہ ''ہم باہر کی زنجیریں تو دیکھتے ہیں ضرور، ہمارے اندر کی غلامیوں کا خاتمہ نہیں ہوتا، کسی کے پاس گناہ زیادہ، کسی کے پاس تھوڑا ہے۔وقت پڑنے پر کب کس نے کس کو چھوڑا ہے، اصل انسان تو ایک واہمہ، ایک خیال ہے، ہرلمحہ ہمارا ہوتا ہے نیا جنم، انسان ہرلمحہ ایک نیا سوال ہے، ہم وہ بہروپئے ہیں، جوساتھ لئے پھرتے ہیں سوچہرے، بھلا چہروں کا یہاں کیا کال ہے؟''

جب رات گہری ہوجاتی اور ساری دنیا خاموشی میں ڈوب جاتی، اس وقت بھٹا چارج سوچتا کہ اس کو جنم دینے والی اسکی ماں کسی گاؤں یا قصبے میں سورہی ہوگی۔اسے ایک بار بھی اپنے بیٹے کی خبر لینے کی فرصت نہیں ملی۔حالانکہ اسے اپنی ماں کا چہرہ تک یاد نہیں۔صرف وہ تصویر ہے جو اسکے باپ کے ساتھ ایک کمسن لڑکی کی تصویر لگی نظر آتی ہے۔بھٹا چارج کو باہر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔یہاں تک کہ اسے اسکول میں بھی نہیں ڈالا گیا تھا۔اسے مراری موہن گھر پر ہی پڑھانے آتے تھے۔وہ بہت محبت سے پڑھاتے تھے۔اوراسی ٹیوٹر کے ذریعے اسے اپنے باپ کی خبر ملتی کہ اس کا باپ اس وقت کے تمام اہم رسالوں میں چھپتا تھا، اسلئے کہ وہ کسان تحریک کا روحِ رواں تھااور زمینداری کے خلاف تحریک چلا رہا تھا۔مراری موہن بہت اچھا پڑھاتے تھے اور کمرے میں رکھی ہوئی الماریوں سے کتابیں نکال کر خود بھی پڑھتے تھے۔لیکن بھٹا چارج کا دل چاہتا تھا کہ حویلی سے باہر بھی گھومے اور اکثر وہ اپنی دادی کے ہمراہ محلے کی سیر کو نکلتا تو عمارتوں، دکانوں وغیرہ کو دیکھ کر حیران رہ جاتا۔مراری موہن پڑھانے کے علاوہ اکثر گاؤں کی کہانیاں سناتے۔ان کا خفیہ تعلق جھمکی سے بھی تھا۔وہ کہانی سناتے سناتے جھمکی کے بلاؤز میں انگلی ڈالتے اوران کی نظر گاؤں سے آتی ہوئی نوکرانی پاپیا پر بھی ہوتی۔یہ دیکھ کر جھمکی، پاپیا کو ہوشیار رہنے کی تاکید کرتی جس پر پاپیا الٹا اسکے پٹواری حرافہ پردھان کے ساتھ اسٹار تھیٹر جانے کی یاد دلا دیتی۔بھٹا چارج کو سب سے زیادہ پسند جوڑا شیومندر تھا۔اب جو بھٹا چارج ان سب باتوں کو یاد کرتا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ اس شہر سے کیسے انقلاب گزرے اور کتنے عروج وزوال رونما ہوئے۔بنگال کی تقسیم، دارالخلافہ کی منتقلی، گورنر جیکس پر حملہ، ڈلہوزی اسکوائر میں بم دھماکہ، بنگال میں قانون ساز اسمبلی کا نفاذ، سبھاش چندر بوس کا کانگریس سے نکلنا، بنگال کا قحط، بھکمری، راستوں پر بھوکے بے جان لوگوں کا ابنوہ، گاندھی کا بھارت چھوڑو نعرہ، جاپانی فوج کا رنگون تک آجانا۔ان سب واقعات نے ابھیمل بھٹا چارج کو کمزور اور بوڑھا بنا دیا تھا۔اوراب وہ بیٹھک بھی ختم ہوگئی تھی۔اب بھٹا چارج اپنے باپ کی لائبریری سے کارلائل، والیٹر، روسو، ٹالسٹائی، لینن، کارل مارکس کی کتابیں دیکھتا اور پھر ڈر کر وہیں رکھ دیتا۔برسوں بعد بھٹا چارج سنسکرت کالج میں لکچرر ہوگیا تھااور تین کو لے بھی وہاں لکچرر تھا۔دونوں چارو دا سے ملے جو نکسل وادی تھے، جو حکومت اور سرمایہ داری کا خاتمہ بندوق کے نال پر کرنا چاہتے تھے۔اس لڑائی میں بھٹا چارج بھی شامل ہوگیا اوراسے پرولیا میں اس تحریک کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے جانا پڑا۔لیکن وہ وہاں جلدی گرفتار ہوگیا اورقریب تھا کہ پولیس دوسرے نکسلیوں کی طرح اس کا کام بھی تمام کردیتی، اس کو کورٹ سے رہائی مل گئی۔وہ کلکتہ چلا آیا اور تحریک سے خود کو الگ کرلیا۔

پھر یوں ہوا کہ جنھوں نے لڑائیاں لڑیں، گولیاں کھائیں، ان کے ہم وطنوں نے ان کو بھلا دیا اور خود سرکاری مراعات آپس میں بانٹ لیں۔اسلئے کہ اصول کیلئے جنگ کرنے والے کبھی اپنی قربانیوں کا سودا نہیں کرسکتے تھے۔وہ چپ چاپ گمنامی کے غار میں چلے گئے۔ایک بار بھٹا چارج اپنی تحریک میں شریک رام سا گر رائے سے ملنے کسبا پہنچا۔وہاں پہنچ کر اسے بہت دکھ ہوا کہ سا گر دا کینسر کے مریض ہوگئے تھے، اُن کی آواز بند ہوگئی تھی۔ان کی اکلوتی لڑکی مینا جو سدا بیمار رہتی، جسے رک رک کر ہسٹیریا کے دورے پڑتے۔رام سا گر رائے کے بعد وہ اکیلی رہ جاتی اسلئے بھٹا چارج نے اس سے شادی کرلی اور اسے رام سا گر رائے کی موت کے بعد اپنے ہاتھ بگان والے آبائی مکان میں لے آیا۔جہاں اسکی بیماری اسے مسلسل پریشان کررہی تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔اُس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ دنیا کو سدھارنے نکلے تھے، آج اپنے اس عمل پر دکھ ہورہا ہے۔بھٹا چارج سوچتا ہے کہ :

''ہم جو دراصل صفر ہیں

اپنے ہونے کا اعلان

کتنی شدومد کے ساتھ کرتے ہیں''

فادر ہرے رام

اس باب میں فادر ہرے رام کی پوری زندگی شروع سے آخر تک بیان کی گئی ہے۔ فادر ہرے رام کا جنم گوا میں ہوا تھا۔ اس کا باپ پرتگالی تھا اور واپس جا کر لاگوس، بحر اوقیانوس کے کنارے جا بسا تھا۔ وہ پرانے گوا کے سیمینار لی میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اسکی ماں ڈورا گونزالیز دھرم تلہ کے لاریٹو میں انگریزی زبان کی ٹیچر کے عہدے پر کام کر رہی تھی۔ وہ کرسمس کے موقع پر اس سے ملنے گوا جاتی تھی۔ اس کی ماں کی پرتگالی شہریت بھی قائم تھی وہ اکثر مریم کی تصویر کے سامنے دوزانو ہو کر عبادت کرتی۔ دوران تعلیم فادر ہرے رام کے اندر تشکیک کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور وہ اکثر سوچتا کہ ''کیا جذبۂ اثباریت کے اندر ہم دنیا کو نہیں پا سکتے؟'' اسی دوران برادر انجیلو میرانڈا گوا آئے، جو کسی نصرانی تنظیم کے ایک رکن تھے اور گوا کے ساحل پر ایک یونانی طرز کے مکان لے لیا تھا، نے فادر ہرے رام سے کہا کہ :

''چرچ کے عدالتی نظام سے پرے بھی ہے ایک انصاف
اگر ہم نے اوروں کی بھوک نہیں محسوس کی
دوسروں کا درد نہیں سہا
کرتے رہے اپنے ہی حصّے کا ماتم
ہمارے پاس رہے گا کیا
ہم ریگستانی دریا کی طرح شور تو مچائیں گے
مگر دیکھتے دیکھتے خوش ہو جائیں گے۔''

اسی طرح فادر ہرے رام (ناتھن)، ٹام اور سوزی ''جذبۂ اثباریت کی بحث اٹھاتے، کلیسائی سچ پر سوالیہ نشان اٹھاتے اور تمام انسانی برادری کی نجات کا راستہ ڈھونڈتے۔ لیکن کوئی حل نہیں نکلتا۔ ٹام ''مختلف مذاہب میں قدر مشترک ڈھونڈتا'' سوزی بہت کم گو تھی لیکن اسکی آنکھیں گہرے سمندر کی طرح ہر وقت محو گفتگو رہتیں۔ وہ امریکہ سے ہندوستان ایک غیر معمولی انسان سے ایک معمولی انسان بننے کی چاہ میں آئی تھی۔ فادر ہرے رام جب سمناری سے فرصت پاتا اور گوا کے ساحلوں پر گھومتا تو اس کے ذہن میں مختلف سوالات جنم لیتے۔ کبھی وہ سوچتا کہ ''انسانوں میں آخر تضاد کیوں ہے؟'' کیا سچائیاں اتنے سارے خانوں میں بانٹی جا سکتی ہیں؟ کیا وہ سچ ایک ہی ہے جو اپنا روپ بدل کر انسانوں میں زندہ ہے؟ ان سوالوں سے نجات اسے کلکتہ آنے پر ملی۔ اسلئے کہ فادر ہرے رام کے خیال میں'' کلکتہ وہ سمندر ہے جس میں بھارت ماں اپنے چیتھڑے دھوتی ہے''۔ لیکن جس طرح سمندر کی تہہ میں جو خوبصورتی اور حسن ہے، اس تک پہنچ پانا ہی نجات کی واحد صورت ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کلکتہ کے مختلف گرجوں کی سیر کرتا رہا لیکن وہ ان لاکھوں انسانوں کیلئے سوچتا رہا جو اس شہر کی سڑکوں پر زندہ لاش کی مانند چلے جا رہے ہیں۔ وہ سوچتا کہ :

''مسیحی تعلیم کا مقصد تھا اگر مغلوب کی حمایت
کیا سماج کے اس غیر واجب ڈھانچے کو
بدلنے کی ضرورت نہیں
جہاں سماج کے حاشیے پر زندہ ان گنت لوگ
وہ عظیم اکثریت
جس کے لئے نہ تعلیم ہے نہ حفظان صحت کے اصول
جو ایک نیم بشری کیفیت میں زندہ ہے
شاید ان تمام امراض کا ہے واحد علاج

ایک منصفانہ سماج۔''

چھٹیوں میں فادر ہرے رام (ناتھن) جب اپنی ماں کے پاس، جوایلیٹ روڈ کے ایک پرانے مکان میں رہتی ہے، آتا ہے تو اسکی ماں اسکو نصیحت کرتی ہے کہ وہ اپنے دل میں کبھی شک کو جگہ نہ دے، کیونکہ یہ مسیحی مشن کے خلاف ہے۔ اسلئے کہ وہ اپنے طور سے اس دنیا کو چلاتا ہے۔ لیکن جب وہ چھٹی گزار کر واپس گوا چلا جاتا تو اسکی وہی پرانی تشکیک سے پُر کیفیت ہوجاتی۔ جب وہ بہت بے چین ہوجاتا تو برادر انجیلو کے ساتھ بحری سفر پر نکل پڑتا اور اسکی منزل زیادہ تر چھوٹے چھوٹے جزیرے ہی ہوتے۔ وہ جن جن علاقوں میں گیا، اسے سبھوں کی حالت ایک جیسی ہی نظر آئی۔ اس کا یہ سفر کئی دہائیوں پر مشتمل تھا۔ ماں ڈورا اپنی ملازمت سے سُبک دوش ہوکر ڈونا پاؤلا کے مکان میں جا بسی تھی۔ لیکن فادر ہرے رام اپنی ماں کی یاد سے دور نہ ہوسکا اور پھر ایک دن اسے اپنی ماں کا خط ملا، جس میں لکھا تھا :

''ناتھن ڈیر
میں نے دیکھا ہے خواب میں
مقدس کنواری، رو رہی ہے خون کے آنسو
مجھے نہیں لگتا میں جیوں گی زیادہ دن
ممکن ہے تم لوٹ کر مجھے نہ پاؤ
مگر میری انتم اچھا ہے
تم کلکتہ جاؤ
تم جو منطقی سوالوں کے جال میں ہو قید
شاید تمہیں وہاں اپنا جواب مل جائے
تمہارا دائمی زخم سل جائے۔''

جب وہ خط پا کر اپنی ماں سے ملنے ہوائی جہاز سے جارہا تھا، ایر ہوسٹس نے اس سے کہا تھا ''میں اپنی ننھی بہن کو بیمار چھوڑ کر آئی ہوں، اس کے لئے پرارتھنا کریں آپ'' تو اس کا دل بھر آیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ :

''کیا تھے میرے پاس اتنے آنسو کے اوروں کیلئے روسکوں
یا پرارتھنا ہے ایک اضافی شئے
مگر یہ بات تو ہے طے
کہ اس کائنات میں ہم صرف دعا ہی مانگ سکتے ہیں
شاید انسان کے درد کا علاج صرف خدا کے پاس ہے
وہ انسان کی پہلی اور آخری آس ہے۔''

اور جب وہ ڈونا پاؤلا پہنچتا ہے تو اسکی قریب الموت ماں اپنے بیٹے کو مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہتی ہے :

''قسم کھاؤ ناتھن
تمہارے رشتہ دار ہونگے دنیا کے نادار و غریب
ان کے نام پر جو ہوئے تصلیب۔''

یہ کہہ کر اس کی ماں نے آخری سانس لی۔ فادر ہرے رام ماں کو دفنا کر فادر میلو کو اپنی ماں کی آخری خواہش بتاتا ہے اور نئے سفر پر نکل پڑتا اور کلکتہ کو اپنے مشن کا مرکز بناتا ہے۔ شروع میں وہ کلکتہ کے ایک چرچ میں بطور ریکٹر مامور ہوا۔ ویسے اپنی ماں کی خواہش کی تکمیل کیلئے نادار، غریب، بے سہارا، جسم فروش، منشیات کے عادی لوگوں کی حاجت روائی اور اصلاح کیلئے دن رات محنت کرنے لگا۔ اس کام میں اسے مختلف پیشے اور مختلف اقسام کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ جن

میں واٹ گنج کے دو دلال نمائی جوگی اور جوگین کھٹال ہیں، تو ان میں ہرن باڑی چکلہ کا ڈان مہاجر مصطفیٰ بھی ہے۔ فیاض اور ہاتھ کٹا قربان بھی ہیں، تھانے کا او-سی- بیمارام چٹرجی اور اشرفی رام جیسا افسر بھی ہے۔ ان کے علاوہ اسکا سابقہ کلیسا، بابا پیٹر، علی بابا، بھٹا چارج اور دوسرے کرداروں سے پڑتا ہے۔ وہ سب کے سب کلکتہ کے جسم پر ابھرے ہوئے زخم کی طرح ہیں، جنکا علاج کسی کے پاس نہیں۔ فادر ہرے رام کی حد سے بڑھی ہوئی ہمدردی جو ان غلط کام کرنے والوں غریبوں اور فٹ پاتھ پر بسیرا کرنے والوں کے ساتھ تھی۔ فادر کے اس عمل نے تھانے کے او-سی۔ بیمارام چٹرجی کو مشتعل کر دیا۔ لہذا تھانے کے او-سی نے فادر کو رنگین بی بی کے ساتھ منہ کالا کرنے کے جرم میں پھانسنا چاہا۔ کیونکہ فادر کی وجہ سے اسکی اوپری آمدنی بند ہوگئی تھی۔ ان تمام دشواریوں کو فادر بڑی خندہ پیشانی سے اٹھاتا ہے۔ مذکورہ اشخاص کی مدد کرتا رہتا ہے۔ اسی دوران گھڑی پال کی محنت کی کمائی ہوئی رقم کو نوبیل سین دھوکہ دے کر لے بھاگتا ہے، جسے فادر ہرے رام اسی بیمارام چٹرجی (تھانے کے او-سی) کے ذریعے وصول کرواتا ہے۔ اس باب میں فادر کی زندگی کے شب و روز بڑی خوبصورتی سے پیش کئے گئے ہیں۔

آخری ضیافت

(یہ اس ناول کا آخری باب ہے۔ شاید اسی لئے اس باب کا عنوان آخری ضیافت، رکھا گیا ہے۔)

صدر اسٹریٹ سے کچھ دوری پر طوطی لین اور مارکوئس اسٹریٹ کے نکڑ پر جٹا دھاری مہانگم کے رستوران میں آج نئے سال کی آمد پر فادر ہرے رام نے ایک محفل ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔ اس محفل میں وہ تمام افراد مدعو ہیں جن سے فادر کا تعلق ہے۔ فادر ہرے رام نے نارمن کو تھوڑی چپس اور شراب بڑھائی اور کہا کہ آج کی رات تم عیش کر سکتے ہو۔ کل تمہیں گرجا سنگھ بنارس لے جائے گا، جو تمہارا جنم استھان ہے۔ ابھی فادر کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ بھٹا چارج نے فادر سے دریافت کیا کہ شاید اسکے بعد ہم لوگ پھر کبھی ایک جگہ نہ ہو پائیں گے۔ وقت کا بگولہ ہم سب کو کیا جانے کہاں اڑا لے جائے۔ گھڑی پال بھی لوٹ جائے گا اور بابا پیٹر بھی کنڈا چلے جائیں گے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ :

''ہم آج زندگی کے ایک اہم سوال کے روبرو کھڑے ہیں
اس شہر نے ہمیں ناگ بن کر ڈس لیا ہے
مگر ہم بدلے میں زہر مہرا بن جائینگے
گھڑی پال کے خواب کی حفاظت سے کر دینگے اعلان
ہمارے اندر بھی زندہ ہے ایک لافانی انسان۔''

پھر بھٹا چارج نے تین ہزار دوسو کی رقم میز پر رکھ دی۔ دراصل فادر کے ان موالی ساتھیوں نے یہ بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ سب مل کر گھڑی پال کا خسارہ جس حد تک ہو، پورا کر دے۔ پھر بابا پیٹر نے چھ ہزار روپئے میز پر رکھ دئے۔ پھر چپکے سے علی بابا نے بھی دس ہزار روپئے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ اور یہ بھی بتایا کہ وہ جو کمرہ لینا چاہتا تھا، اب وہ کمرہ نہیں لے پائے گا۔ اس کے رستوران کے مالک نے اسے رہنے کی جگہ دے دی ہے۔ گھڑی پال، علی بابا کی اس قربانی پر آب دیدہ ہوگیا۔ چورنگی نے ان لوگوں سے پیسے اینٹھے جو مذہب بدلنے کے نام پر دیا کرتے ہیں، ان میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی اور عیسائی بھی۔ چورنگی نے سبھوں سے پیسے لئے لیکن وہ چورنگی کا چورنگی ہی رہا۔ وہ پیسے اس نے گھڑی پال کو سبھوں کی طرح دے دیا۔ اور کلیسا جو بقول خود ابتک اپنے آپ کو چورنگی کیلئے بچا رکھی تھی، اب اس نے خود کو سیٹھ لنگی لال کے ہاتھوں بیچ دیا اور جو روپیہ اور سونے کی چین اسے ملے وہ سب اس نے گھڑی پال کو دے دیئے، اور خود سونا گاچھی کے امام بخش لین کی مکینی اختیار کرنے پر راضی ہوگئی۔ ان تمام دوستوں کی امداد نے گھڑی پال کو رونے پر مجبور کر دیا۔ اسکے بعد فادر ہرے رام (ناتھن) نے بہت ہی اخلاقی اور فلسفیانہ تقریر کی۔ جسکا لب لباب یہ تھا کہ انسان گرچہ آج دولت کی موہ میں گرفتار ہے، لیکن اسکی یہ کمزوری ایک دن ختم ہوجائے گی اور اسکے اندر کا انسان جاگ جائے گا، تب وہ ایک اچھا انسان بن جائے گا۔ فادر نے ریکسن کی ایک تھیلی سے دس دس ہزار کی چار گھڑیاں نکالیں اور کہا:

''یہ وہ رقم ہے جسے گھڑی پال نے محنت سے کمایا
میں بیمارام کا شکر گزار ہوں
کہ اس نے دلائی واپس یہ رقم

کسی نے سچ کہا ہے
ٹیڑھی انگلیوں کے بغیر گھی نہیں نکلتا
مگر پاک مسیح کی قسم
آج میں نے اثیار کی دیکھی ہے وہ شکل
کہ دنگ رہ گئی ہے میری عقل
فیاض، بھٹا چارج، چورنگی، کلیسا
بابا پیٹر، وہ زمین پر بھیجا گیا فرشتہ
تم لوگوں نے وہ مثال کی ہے قائم۔''

فادر کی تقریر کے بعد جب اس نے ہوٹل کا بل چکایا اور نیچے سڑک پر آئے تو راستے میں پانی بھرا تھا۔ فادر نے ایک ٹیکسی رکوائی اور کہا :

''میرے کچھ دوست بوڑھوں کے آشرم میں رہتے ہیں
دیکھیں وہ اس گنہ گار پادری سے کیا کہتے ہیں
مجھے لے جانی ہیں ان کے لئے شراب کی بوتلیں اور کیک
ایک آخری ملاقات، ریجن بی بی کیلئے ہے مخصوص
اس گناہ گار پادری کے پاس کیا ہے
بس ایک نیک دل دوستوں کا جلوس۔''

اختتامیہ

بابا پیٹر کے کناڈا اور فادر ہرے رآم کے پرتگال چلے جانے اور نارمن جیل بنارس اور گھڑی پال کے گاؤں چلے جانے کے بعد چورنگی کی سڑکیں ویران ہوگئیں۔ صرف چورنگی اپنے چہرے کو مٹی میں چھپا کر اور کلیسا اپنا جسم بیچ کر پیسہ کماتے ہیں۔ بھٹا چارج اور فیاض اپنی مے نوشی میں خود کو فنا کر رہے ہیں۔ لیکن ان دونوں کو اچھی لگتی ہے کلیسا اور چورنگی کی محبت۔

یہ تھے ناول کے پلاٹ اور اس کے کرداروں کی سرگزشت۔ اس سے قبل کہ ناول کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے، بہتر ہوگا کہ یہ جان لیں کہ ناول کے سلسلے میں ناشر، خود مصنف اور جوگندر پال کیا فرماتے ہیں :

(۱) کتاب کے فلیپ پر ناشر کی رائے یوں ہے :

''چارنک کی کشتی'' صدیق عالم کا ایک ایسا منفرد ناول ہے جو ایک بہت ہی وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں شہر ایک بے کنار سمندر کی علامت بن جاتا ہے۔ جس میں کرۂ ارض سے لوگ ندیوں کی طرح آتے اور ضم ہوتے رہتے ہیں۔ کرداروں اور واقعات کا ایک بوکھلا دینے والا ہجوم ہے جو اس سمندر میں تیر رہا ہے۔ گرچہ یہاں واقعات اہم کرداروں کی زبان سے بیان ہوتے ہیں۔ ناول کے آخر میں تمام کردار اور تمام ذیلی پلاٹ مل کر ایک انتہائی حیرت انگیز کلائمکس کی تشکیل کرتے ہیں۔

اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مرکزی کردار وہ عناصر ہیں جو یا تو سماج میں ناموزوں (social misfit) سمجھے جاتے ہیں (بھٹا چارج، فادر ہرے رام) سماج کے رد کردہ (Social Discard) ہیں (چورنگی، بابا پیٹر) Socially Corroded (ایلین، مقیم) یا سماج کی نادیدہ قوتوں کے استحصال کا شکار (کلیسا، علی بابا، گھڑی پال) وغیرہ وغیرہ۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ان تمام کرداروں میں کلکتہ کے بانی جاب چارنک کے کردار کی تمام متضاد خصوصیات موجود ہیں جو خود بھی ایک سیمابی اور سیلانی طبیعت کا آدمی تھا۔ شاید چارنک ان ناواجب اور نادرست کرداروں کے اندر آج

بھی زندہ ہے اور کلکتہ چارنک کی وہ کشتی ہے جو اپنے جاوداں سفر پر رواں ہے۔ ناول کے یہ کردار سماج کے حاشئے پر زندہ ضرور ہیں۔ مگر سماج پر جن افراد کا قبضہ ہے کیا وہ صحیح معنوں میں ان عناصر پر فیصلہ دینے کی سندر کھتے ہیں؟.....''

(۲) جوگندر پال رقمطراز ہیں :

''مصنف نے، ساڑھے چار سو صفحات کی اس طویل ترین نثری نظم میں، ایک قدیم شہر کی روح کو کچھ ایسے انوکھے اور متحرک انداز میں، اپنی تلاش میں، اپنے حالیہ مقامات پر بھٹکے ہوئے دکھایا ہے کہ آپ ہی آپ ناولاتی وقوعوں میں گندھا چلا جاتا ہے۔ اور ان دونوں صفتوں کے ازدواج کا یہ عالم حسن فطرت اور کھلا معلوم ہوتا ہے، اتنی طوالت کے باوصف بیان کہیں ڈھیلا معلوم نہیں پڑتا۔ یہ اپنے وارداتی اچھال میں بہت اچھا ہے۔ ایک مسلسل گہما گہمی کے بعد، اختتامیہ موڈ کے قیام پر آتے آتے قاری بڑے اطمنان سے منہ کھلا چھوڑ کر سوچنے لگتا ہے۔''

(ماہنامہ شاعر اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۰)

(۳) افتخار امام صدیقی کے استفسار پر مصنف کہتے ہیں :

''ناول لکھنے کے بعد میری ذمہ داری ختم ہوگئی ہے۔ اب میں اس کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں۔ قارئین یا ناقد اسے جس طرح چاہیں، پڑھیں سمجھیں یا ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔''

(ماہنامہ شاعر اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۱)

شاعر کے اسی شمارے میں صفحہ ۱۶ پر مصنف کی تحریر کا عکس بھی ملاحظہ فرمائیے :

''.....ناول ''چارنک کی کشتی'' منظوم شکل میں لکھنا کوئی شعوری واقعہ نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا خیال اچانک نثری نظم کی ہیئت میں ڈھل گیا اور صفحات در صفحات لکھتے چلے گئے۔ جیسے کلکتہ میری انگلی پکڑ کر مجھ سے لکھوا رہا ہو۔ مجھے علم تھا نثری نظم کی ہیئت لوگوں کے گلے سے نیچے نہیں اترتی، اوپر سے ایک ضخیم ناول نثری نظم کی ہیئت میں، یہ تو گویا کسی بیس منزلہ عمارت سے سر کے بل کود جانے کے مترادف تھا۔ ناول خود کو لکھوانے پر مصر تھا۔ میں تو صرف ایک اضافی حیثیت رکھتا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ایسی بھی راتیں گذری ہیں جب کہ قلم میری آنکھوں کے سامنے از خود سب کچھ لکھتا جا رہا تھا، تو شاید لوگ اس کا یقین نہ کریں۔ مگر یقین کریں، میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ کاش آپ میری نفسیات کے تار عنکبوت میں جھانک سکتے۔ آپ کو وہاں دونوں ہاتھ سے مفلوج ایک مجبور انسان دکھائی دیتا۔ اور ایک کتاب جو اس سے کچھ دور ایک قلم سے خود کو لکھوا رہی تھی۔''

مذکورہ تینوں اقتباسات پر اگر فرداً فرداً غور کیا جائے تو ان کے نتائج بڑے ''معنی خیز اور مضحکہ خیز'' دونوں نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس ناول کی شانِ نزول کا بھی علم ہوتا ہے، اور ایسا لگتا ہے، تینوں اقتباسات مل ملا کر چیستاں بن گئے ہیں۔

پہلا اقتباس جو ناشر کا ہے، میں موصوف نے ''شہر'' کو ایک ''بے کنار سمندر'' کی ''علامت'' قرار دیا ہے۔ ''کرۂ ارض'' سے یعنی پوری دنیا سے لوگ آتے اور ندیوں کی طرح اس ''سمندر'' میں ضم ہو جاتے ہیں۔ ''کرداروں اور واقعات'' کا ایک بوکھلا دینے والا ''ہجوم'' ہے جو اس علامتی سمندر میں ''تیر رہا ہے''۔ یہاں واوین میں دیئے گئے الفاظ اور جملوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

دوسرے پیراگراف میں ناشر موصوف نے صحیح فرمایا ہے کہ اس ناول کی بڑی خوبی اس کے 'سماج کیلئے ناموزوں'، 'ردکردہ' اور 'نادیدہ قوتوں کے استحصال کے شکار' کردار (عناصر؟) ہیں۔ جو حاشئے پر ضرور ہیں، لیکن کیا سماج پر قابض افراد حقیقت میں ان کرداروں (عناصر؟) پر فیصلہ صادر کرنے کی ''سندر کھتے ہیں؟'' لیکن ان کا سوال کچھ عجیب سا لگتا ہے کیونکہ سماج کا ڈھانچہ صرف اشرافیہ سے تعمیر نہیں ہوتا بلکہ اس میں ہر طبقے اور درجے کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ اور پھر اگر سماج میں ایک طبقہ پچھڑا ہوا ہے تو اس کا ذمہ دار پورا سماج اور اس کا نظام ہے۔ ایسے میں کسی کو کسی کے اچھے یا برے ہونے کے فیصلہ دینے کا اختیار نہیں ہے۔

دوسرے اقتباس میں جوگندر پال نے بالکل درست فرمایا ہے کہ مصنف کو داستان طرازی پر مہارت حاصل ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت سے باہر نکلنے نہیں دیتا۔ اور مصنف نے ''شہر کی روح'' کو اپنی ''ذات کی تلاش'' سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ واقعات خود بخود وقوع پزیر ہوتے ہیں۔

تیسرے اقتباس، جو دو حصوں پر ہے، میں مصنف اپنی تصنیف (ناول) کے سلسلے میں بہت کنفیوز ڈنظر آتے ہیں۔ پہلا حصّہ افتخار امام صدیقی کے استفسار کا جواب ہے۔ اس میں مصنف کا یہ کہنا کہ ''ناول لکھنے کے بعد میری ذمہ داری ختم ہوگئی۔'' اور ''قارئین یا ناقد (ناقدین) اسے جس طرح چاہیں پڑھیں، سمجھیں یا ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔''

پھر دوسرے حصّے میں یہ کہنا کہ ''ناول خود کو لکھوانے پر مصر تھا۔ میں تو صرف ایک اضافی حیثیت رکھتا تھا''.....مزید یہ کہ ''ایسی بھی راتیں گذری ہیں جب میں نے خود اپنی کھلی کاپی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھا پایا ہے۔ جب کہ قلم میری آنکھوں کے سامنے از خود سب کچھ لکھتا جا رہا تھا۔''

ان دونوں بیانات میں مصنف کے اندر تجاہل عارفانہ، خودستائی اور تعلّی کے ایک ملے جلے احساس کے ساتھ خود اعتمادی کی کمی بھی نظر آتی ہے۔ کیونکہ جو تخلیق از خود عالم وجود میں آئے اسے ''ڈسٹ بن'' میں پھینکنے کی بات کرنا یا سوچنا، مناسب نہیں۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ ناول نگار نے کس حد تک ناول کے فن کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ناول سے بہت قبل صلاح الدین پرویز کا ناول ''نمرتا'' نثری نظم کے فارم میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۸۰ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔ ''نمرتا'' کے سلسلے میں محمود ہاشمی لکھتے ہیں :

> ''صلاح الدین پرویز کی یہ تخلیق اپنے لسانی ڈھانچے اور اسلوب و آہنگ میں اس عہد کی تمام تخلیقات اور تخلیقی رویوں سے منفرد ہے.....یہ ناول ہے یا کتھا کہانی یا رزمیہ، نثری شاعری ہے یا افسانی یا ایسی بے ہیئت تخلیق جو نثر اور نظم کے فرق کو مٹاتی ہے؟ یا اظہار کا کوئی نیا اسلوب جو انتہائی غیر معمولی ہے؟ یہ تمام سوالات ایسے ہیں جن پر غور کرنے کی ذمہ داری اس عہد کے ناقدوں کی ہے۔''

مذکورہ اقتباس میں انہوں نے ''نمرتا'' کی انفرادیت، اسکے ''لسانی ڈھانچے اور اسلوب و آہنگ'' بتا کر اپنا دامن جھاڑ لیا اور قاری اور نقاد کیلئے کئی سوالات چھوڑ دیئے۔ حالانکہ جو سوالات انہوں نے اٹھائے ہیں وہ یقیناً قابل غور ہیں۔ بہتر ہوتا اگر وہ ان سوالات کے جواب اپنے طور پر تلاش کرتے یا ان کی طرف اشارہ کرتے، اور یہ بتاتے کہ اس قسم کی تخلیق کیا عہد حاضر کیلئے Relevant ہے، بھی یا نہیں۔ جس میں دیومالائی اور اساطیری قصّے کا بیان، علامتی اور استعارتی نہ ہو، بلکہ ''گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ را'' کے مصداق ہو۔

''چارنک کی کشتی'' کا معاملہ اسکے بالکل برعکس ہے۔ اسکی انفرادیت صرف لسانی ڈھانچہ اور اسلوب و آہنگ ہی نہیں، بلکہ مواد اور موضوع ہے، اس کا پلاٹ اور ماحول ہے۔ اسے اگر شہر کلکتہ کے ایک مخصوص طبقے کی سچی روئداد کی ایک جرأت مندانہ پیش کش کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

یہ ایک طبقاتی تاریخ ہے جو چارنک کی آمد لے کر زمانۂ حال تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہاں، اس تاریخ میں اشرافیہ یا حکمراں طبقہ کی روئداد اور سوچ کم اور عوام کے اس طبقے کا ماجرا زیادہ ہے جو اشرافیہ سماجی طور پر Discard کر دیئے گئے ہیں۔ اس ناول میں ان لوگوں کی زندگی کی جھلک ہے جو اشرافیہ اور طاقتور طبقے کے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اس ناول کے سارے کردار الگ الگ معاشرتی، سماجی اور مذہبی ماحول کے عکاس ہیں، جن کی پیدائش اور پرورش سڑکوں پر ہوتی ہے۔ یا وہ طبقہ جو اس شہر میں دور دراز سے روزی روٹی کے چکر میں آیا اور فٹ پاتھی بن کر رہ گیا۔ اس ناول میں نہ تو اعلیٰ طبقے کی خوش گوار زندگی کی عکاسی ہے اور نہ متوسط طبقے کے سیکڑوں مسائل سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے افراد کی سرگزشت ہے۔ یہ ناول اس طبقے کی زندگی سے علاقہ رکھتا ہے جو سماج کے اعلیٰ طبقوں کے خیال میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ناول نگار نے اس طبقے کے اندر بھی ان اعلیٰ قدروں کو تلاشا ہے جو عام طور پر ان خود ساختہ اعلیٰ طبقوں میں مفقود ہیں۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو ان میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور شامل ہے۔ اس ناول میں ان پست طبقوں کی زندگی کا بڑا بے باکانہ اظہار ہے، جس طبقے کو اشرافیہ تو درکنار، متوسط طبقہ بھی منہ لگانا کسر شان سمجھتا ہے۔ ناول میں جہاں اس طبقے کی گری ہوئی ''حرکتوں'' کو دکھایا گیا ہے، وہیں ان کے اندر پوشیدہ ایثار اور قربانی کے جذبے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس ناول میں ناول نگار کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی فرد قابل نفرین نہیں ہے۔

غرض، یہ ناول اپنے مواد، اسلوب اور ہیئت کے لحاظ سے قابل توجہ ہونے کے باوجود مقبولیت کی ان سرحدوں کو چھونے میں شاید کامیاب نہ ہو سکے جسکی یہ متحمل ہے۔ میرے خیال میں اگر ناول نگار اپنی اس تخلیق کو نثری نظم کے پیرائے اظہار کی بجائے سلیس نثر میں لکھتے تو خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہوتی۔ پھر بھی یہ اپنے طرز کا پہلا ناول ہے جسے بنگال کی سرزمین پر لکھا گیا ہے۔ اگر علاقائی عصبیت سے اوپر اٹھ کر دیکھا جائے تو اسے کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا

۔اور یہ اردو ناول کی تاریخ میں عموماً اور بنگال میں لکھے گئے ناولوں کے زمرے میں خصوصاً، ایک اہم مقام کا دعویدار ہے۔

رانگ نمبر

مشتاق انجم کا یہ ناول نومبر ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ناول ۱۷۶ صفحات پر محیط ہے جن میں ۲۸ مختصر ابواب، ایک دیباچہ ۵ صفحات پر ''رانگ نمبر میری نظر میں'' (مقصود الٰہی شیخ) اور ۳ صفحات پر ناول نگار کا اپنا اظہار بعنوان ''ہم بھی کچھ عرض کریں'' ہے۔ مقصود الٰہی شیخ نے کچھ اس انداز کا دیباچہ لکھا ہے کہ قاری پر ناول سے متعلق ایک خوشگوار تاثر قائم ہو جائے۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ مصنف نے ''ہم بھی کچھ عرض کریں'' میں کسی ادبی جلسے کی روداد لکھی ہے جس میں کسی مقرر نے بنگال کی ادبی فضا پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہا کہ :

''..... یہاں کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ دہلی، لکھنؤ یا علی گڑھ میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں یا کلکتہ میں۔ کہیں سے بھی مغربی بنگال کی بو باس نہیں ملتی.....''

(پتہ نہیں وہ کون صاحب تھے، اگر نام ظاہر ہو جاتا تو میں بھی ایسے ''صاحب علم و آگہی'' سے مل کر کچھ ''کسبِ نور'' کرتا) حقیقت تو یہ کہ جن صاحب نے یہ جملہ کہا ہو، انھوں نے بنگال میں لکھے ہوئے ناولوں کا مطالعہ کیا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک میری معلومات ہے، بنگال کا سب سے پہلا طبع زاد ناول ۱۹۰۸ء احسن (بدرالزماں بدر کلکتوی) سے لیکر ''چار رنگ کی کشتی'' ۲۰۰۴ء (صدیق عالم) تک تقریباً دو درجن ناولوں میں زیادہ تر ناول کی فضا ہگلی، کلکتہ، مٹیا برج وغیرہ ہی ہے۔

بہر کیف، ناول نگار کے آخری جملے کو ''اس گفتگو کو یہاں مختصر کرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ معزز قارئین ''رانگ نمبر'' کو صحیح تناظر میں رکھ کر غور فرمائیں''۔ پتہ نہیں موصوف کی مراد ''صحیح تناظر'' سے کیا ہے؟ شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس ناول کو ہوڑہ کی فضا کے پیشِ نظر رکھ کر مطالعہ کیا جائے۔

ناول کا پلاٹ یہ ہے کہ چار دوستوں کی ایک ٹولی ہے جس میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ لڑکوں میں ایک مسلمان ہے جس کا نام شجیل احمد ہے، دوسرا ہندو سمر ہے۔ لڑکیاں دونوں ہندو ہیں۔ مایا اور شانتی۔ یہ کہانی ان چاروں کی داستان عشق ہے۔ شجیل، شانتی سے جڑا ہوا ہے اور سمر، مایا سے۔ مایا اور سمر دونوں ایک آفس میں ملازم ہیں۔ جبکہ شجیل کسی ٹریول ایجنسی میں ملازمت کرتا ہے۔ شانتی کا باپ چودھری بابو کا کاروبار اور ایک تین منزلہ مکان ہے۔ جس کی وجہ سے اسے ملازمت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ مطالعہ اور سنگیت میں مصروف رہتی ہے۔ مکھرجی بابو ایک پڑھے لکھے اور زمانہ شناس کاروباری ہیں۔ وہ سقوط مشرقی پاکستان سے قبل وہاں ڈھائے گئے مظالم کا شکار ہوتے ہیں۔ کچھ سرمایہ اور اپنی چھوٹی بچی شانتی کو بچا کر کلکتہ لانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ باقی افراد خاندان مارے جاتے ہیں۔ شجیل کا تعلق یوپی سے ہے جو وہاں گاؤں کے فساد میں اپنے باپ کو گنوا کر اپنی ماں کے ساتھ کلکتہ آبستا ہے۔ یہ فکری طور پر قدامت پسند عورت ہے اسلئے کہ جب شجیل اپنی ماں سے شانتی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو وہ انکار کر دیتی ہے۔ ناول میں ضمنی کہانی بمبئی کے ہوٹل کے مالک شجاع احمد کی بھی ہے، جو ہوٹل خریدنے سے پہلے بخران (ریاض) میں ایک شخص واحد صاحب کی دوکان میں ملازمت کرتا تھا۔ واحد کی ایک بیٹی عالیہ تھی۔ شجاع نے اپنی خدمت، خصوصاً واحد صاحب کی علالت کے وقت اپنی ایمانداری اور حسن سلوک سے ان کا دل جیت لیا اور عالیہ سے اسکی شادی ہوگئی۔ واحد صاحب کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ کا بھی تھوڑے دنوں کے بعد وصال ہو گیا۔

آخر میں شجاع اور عالیہ نے بخران کا کُل اثاثہ فرخت کر کے بمبئی میں ہوٹل اور رہائشی مکان خرید لیا۔ شجاع اور شجیل کی ملاقات بمبئی کے عارضی قیام کے دوران رگھوناتھ کرواتا ہے۔ رگھوناتھ وہاں اُس کمپنی میں ملازم ہے، جس سے شجیل کی ٹریول ایجنسی رابطہ رکھتی ہے اور جو لوگوں کو ملازمت کی غرض سے باہر کے ملکوں میں بھیجتی ہے۔

ناول ''رانگ نمبر'' کا اختتام بڑا ہی بے ربط ہے۔ کہانی پورے طور پر انجام پذیر نہیں ہو پاتی ہے۔ آخری باب میں شجیل بمبئی کے ہوٹل میں رگھوناتھ کے فون کو ''رانگ نمبر'' کہہ کر کاٹ دیتا ہے۔

اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ وہ رگھوناتھ کے ساتھ بمبئی کی شام گزارنا اسلئے نہیں چاہتا کہ اسے شانتی کی یاد آتی ہے تو بھی اس سے کہیں یہ پتہ نہیں

چلتا کہ شانتی اور وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے ہیں۔ پھر سمر، مایا اور مکھر جی بابو کے بارے میں قاری کو کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوا۔

کرداروں میں بھی کوئی کردار، سوائے مکھر جی بابو کے، ایسا نہیں جو قاری کو متاثر کر سکے۔ کہانی کا ہیرو خود ایک مجہول کردار ہے، جو ذہین تو ہے مگر متحرک نہیں۔ اسکے اور اسکے دوست سمر کے تمام حرکات وسکنات ''اسٹوریوٹائپ'' ہیں۔ کردار شانتی پر اگر محنت کی جاتی تو اس کے اندر متاثر کن کردار بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ مایا کے کردار کو ابھارنے کا موقع پلاٹ میں موجود ہے، لیکن ناول نگار Treatment میں بالکل نوآموز اور ناول کے فن سے ناآشنا نظر آتا ہے۔

ناول کے فن کے اجزائے ترکیبی میں ایک عنصر مقصدیت ہے۔ لیکن اس ناول میں دوسری فنی کمیوں کے ساتھ مقصدیت کا بھی فقدان ہے۔ حالانکہ جناب مقصود الٰہی شیخ نے لکھا ہے کہ :

> ''ان کرداروں اور آس پاس کے چلتے پھرتے لوگوں کا احساس دلاتے ہوئے ایک ایسی کہانی بُنی گئی ہے کہ اس کے اندر سے مقصدیت پیدا ہو کر اجالا کرتی ہے''۔

موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ ''بُنی گئی'' اس کہانی کے ''اندر سے'' ''مقصدیت پیدا ہو کر کیا اجالا کرتی ہے؟'' اسکی وضاحت کر دیتے تو بہتر ہوتا۔

جیسا کہ اوپر درج کیا گیا کہ کہانی بہت ہی بے ربط طریقے سے ختم ہوتی ہے۔ کسی کردار کے انجام سے قاری واقف نہیں ہوتا۔ اگر ناول نگار یہ چاہتا ہے کہ قاری خود اپنے طور پر اس کا انجام طے کرے تو یہ دوسری بات ہے۔ ویسے کہانی کے اختتام سے میرے ذہن میں جو سوالات ابھرتے ہیں، وہ کچھ یوں ہیں :

سمر اور مایا کیا ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں؟ شجیل، مکھر جی بابو کی بیٹی شانتی سے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف شادی کر لیتا ہے؟ آخر شجیل کیا فیصلہ کرتا ہے؟ بڑے شہروں میں انٹر کاسٹ شادیوں کا رواج عام ہے۔ لیکن ناول نگار نے واضح طور پر یا اس سلسلے میں کچھ کہنے سے کیوں گریز کیا، یا اپنے کرداروں کو کرنے سے کیوں روکا؟

ناول کا فن اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ ناول نگار جزئیات نگاری سے کام لے کر محاکاتی فضا قائم کرے۔ لیکن ناول نگار کو یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، سوائے باب ۲۴-۲۵ کے، جن میں ''لکھنؤ سے کچھ دور ایک خوبصورت گاؤں'' میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑنے کی وجہ سے شجیل کے والد کا قتل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی والدہ کے ہمراہ بڑے ابو کے مشورہ سے کلکتہ میں آبستا ہے۔ حالانکہ جناب مقصود الٰہی شیخ نے رواروی میں بہار کا فساد لکھ دیا ہے۔

> ''ہیرو بہار میں فرقہ واریت وفسادات کے مارے خاندان سے ہے''۔ (ص - ۱۱)

ان دو ابواب میں ناول نگار نے بڑی چابکدستی سے فضا آفرینی کی ہے۔ سارا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ کاش دوسرے ابواب بھی ایسے ہی ہوتے!

ناول کی زبان سپاٹ بیانیہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور مکالمے ضرور ہیں لیکن ان جملوں اور مکالموں میں جو گہرائی اور گیرائی ہونی چاہئے، اس کا فقدان ہے۔ البتہ مکھر جی بابو کی زبان سے جو مکالمے ''ادا کرائے گئے ہیں'' وہ بظاہر غیر فطری ہونے کے، دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔

''اقبال'' اور ''ودیا ساگر'' پر سوانحی لکچر معلوماتی ہونے کے باوجود اَن میل ہیں۔ ناول یا ڈرامے میں اس قسم کی تقریر بوجھل پن کا سبب بنتی ہے۔

بہرکیف، مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ناول نگار کو ناول نگاری کے فن سے قطعی واقفیت نہیں ہے اور نہ ہی انہوں نے اچھے اور بڑے ناولوں کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ ناول بنگال کا سب سے تازہ (۲۰۰۶ء) اردو ناول ہے۔ لیکن افسوس کہ سب سے کم تر درجے کا ہے۔

پچھلے صفحات میں بنگال میں شائع شدہ ناولوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی ناول سے متعلق رائے بھی دے دی گئی ہے۔ ان آرا کو اگر یکجا کیا جائے تو اسکی صورت کچھ یوں ہوگی۔

احسن

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں، ۱۹۰۷ء کے ناولوں میں ''احسن'' کا مقام کچھ کم اہم نہیں ہے۔ جس طرح اس دور کے دوسرے ناولوں میں سماجی مسائل اور برائیوں کی نشاندہی کہانی کی شکل میں پیش کر کے اصلاح کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح احسن میں بھی یہ کاوش ملتی ہے۔ اس ناول میں اس وقت کے مسلم سماج کے کئی شیڈس ہیں، جو قاری کو اپنی گرفت میں رکھنے میں کامیاب ہیں۔

چاند تارا

اس ناول میں روایتی انداز کو اپنایا گیا ہے۔ بیشتر حصّے ڈراموں کی طرح مکالمے کے فارم میں ہیں، لیکن جو حصّہ بیانیہ ہے، اس میں ایک طرح کی دلکشی اور کشش ہے۔

آبرو

اس ناول کے تانے بانے بننے میں مصنف نے بڑی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ناول نگاری کے فن کی پوری طرح پاس داری کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ بنگال کے قحط کی ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

نیا آدمی

اس ناول میں کہانی کار نے بڑی خوبصورتی سے کردار سازی کی ہے۔ کوئی کردار ایسا نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ کہانی کار کے حکم کے تابع ہے۔ غرض، یہ ناول دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

بزم آرا

یہ ایک سبق آموز ناول ہے جو بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے کردار زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار ہمارے آس پاس ہی کے ہیں اور ان کے اندر خیر و شر کی انسانی خصوصیت موجود ہے۔ ناول کی زبان سلیس اور صاف ہے۔ انداز تحریر خوبصورت ہے، گرچہ مکالماتی ہے۔

شکست و فتح

یہ ناولٹ سوائے سلیمہ کی کردار نگاری کے، ناول کے دوسرے لوازمات سے عاری ہے۔

سرلا

یہ ناول اپنے پلاٹ کے لحاظ سے نیم رومانی، معاشرتی ہے۔ اس میں کردار نگاری بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ غرض، یہ ناول اپنی چند کمزوریوں کے باوجود ایک اچھی کوشش تصور کی جا سکتی ہے۔

آخری شکست

تاریخی ناول میں واقعات کی نیرنگی تو نہیں ہوتی، تاریخ کے اوراق پارینہ ہوتے ہیں۔ اسلئے مصنف کو بیانیہ اور مکالمے کے سہارے واقعات کو بڑھانا پڑتا ہے اور وہ منظر کشی کرنی پڑتی ہے کہ قاری کے سامنے گذشتہ ادوار کی تصویر ابھر آئے۔ اس لحاظ سے جان عالم سیف کامیاب ہیں۔

پھول بنے انگارے

ناول کی کہانی عصری تقاضوں، مثلاً معاشی حالات، سماجی زندگی کے تقاضے اور سیاست ان سب سے مبرا ہو کر صرف عورت اور رومانس کے گرد گھومتی ہے۔ اگر ان بنیادی حقیقتوں کو اس رومانس سے ہم آہنگ کیا جاتا تو شاید یہ ایک اہم ناول قرار پا سکتا تھا۔

روپ متی

تاریخی واقعہ کو جان عالم سیف نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے تاریخی ناول کے روپ میں ڈھالا ہے ان کی کامیابی دراصل ان کے اسلوب اور انداز بیان کی وجہ سے ہے۔ وہ تاریخ اور رومان کو اسطرح ہم آہنگ کرتے ہیں کہ دونوں شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

پیاسے دل

ابراہیم اختر کے یہاں کہانی کے تانے بانے بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ان کے اس ناول کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مسلسل لکھتے رہتے تو اردو ناول نگاری میں ان کی پہچان بن سکتی تھی۔

وائسرائے کپ

اس ناول کی دو اہم خوبیاں ہیں۔ایک،اس کی زبان دوسرے،نسیم (کردار) کے دوستوں کو نام دینے کی بجائے نمبر دیئے گئے ہیں۔

خوابِ بیداری

چونکہ ان (مصنفہ) کا یہ پہلا ناول ہے،اسلئے ناول کے مروجہ معیار پر پورا نہیں اترتا ہے۔

موت کا سایہ

اس ناولٹ میں صغریٰ سبزواری کا انداز تحریر بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہے۔ان کو کہانی بیان کرنے کا فن آتا ہے۔کہانی میں شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے،ان کی زبان بڑی صاف ستھری اور پُر اثر ہے۔

شہر توران

یہ ایک طرح سے اردو کی کئی داستانوں کا چربہ ہے، جسے نوآموزی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔زبان اور اسلوب میں بھی کوئی کشش نہیں۔

وفا کی ڈور

ناول کی زبان بہت ہی سپاٹ اور سادہ ہے۔مصنفہ کو کردار نگاری پر کوئی دست رس نہیں ہے۔وہ کسی بھی کردار کو اچھی طرح اجاگر نہیں کرسکیں۔غرض، یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہے۔

بھنور

ناول کا انداز بالکل فلمی ہے۔لگتا ہے ناول نگار کا ذہن فلمی واقعات، حادثات اور مکالمے سے بُری طرح متاثر ہے۔ویسے مصنف ترقی پسندوں کی طرح مزدوروں اور غریبوں کا ہمدرد نظر آتا ہے۔

نئی زندگی

یہ ایک سماجی ناول ہے،اسکی زبان حقیقت سے قریب ہے۔طرز تحریر میں دلچسپی ہے،لیکن کہیں کہیں بوجھل پن محسوس ہوتا ہے۔

خزاں کے بعد

اس ناولٹ میں کوئی کردار پورے طور پر نہیں ابھرتا ہے زبان میں کوئی دلکشی نہیں۔مجموعی طور پر یہ ایک اوسط درجے کا ناولٹ ہے۔

جھاں آرا

ناول میں لکھنؤ اور دوسرے لکھنؤ (مٹیا برج) میں مقیم واجد علی شاہ کے شاہی خاندان کے افراد کی زندگیوں کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ناول میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ بڑی صاف، شستہ اور دلکش ہے۔

پکار

مصنف کو ناول کے فن کو برتنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ان کا لہجہ خطیبانہ ہوجاتا ہے۔اس موضوع (ہندو-مسلم فساد) پر اچھا ناول بن سکتا تھا۔

دکھ کے بادل، سکھ کی پھوار

یہ ایک معاشرتی اور رومانی ناول ہے۔ کہانی کا انداز فلمی ہے۔ اسے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''امراؤ جان ادا'' سے متاثر ہوکر لکھا گیا زبان صاف ستھری اور سلیس ہے۔

غم کی چھاؤں میں

یہ ایک رومانی اور معاشرتی ناول ہے، جس میں خاندانی چپقلش کے ساتھ ساتھ عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور ان سے پیدا شدہ مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ مجموی طور پر یہ ایک اوسط درجے کا ناول ہے۔

روٹھی طوفان سے ساحل تک

اس ناول کی کہانی متمول کٹر مسلم گھرانے کی آپس کی چپقلش اور ریشہ دوانیوں پر مبنی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ رومانی بھی ہے مصنفہ نے بڑے سلیقے سے کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ ان کے طرز بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ قاری کہانی کار کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستا چلا جاتا ہے۔

چارنک کی کشتی

یہ ناول اپنے مواد، اسلوب اور ہیئت کے لحاظ سے قابل توجہ ہونے کے باوجود مقبولیت کی ان سرحدوں کو چھونے میں شاید اس حد تک کامیاب نہ ہو سکے، جس کا یہ حامل ہے۔ میرے خیال میں اگر ناول نگار اپنی اس تخلیق کو نثری نظم کے پیرائے اظہار کی بجائے، سلیس نثر میں لکھتے، تو خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہوتے۔ پھر بھی یہ اپنے طرز کا پہلا ناول ہے جسے بنگال کی سرزمین میں لکھا گیا ہے۔ اگر علاقائی عصبیت سے اوپر اٹھ کر دیکھا جائے تو اسے کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا، یہ اردو ناول کی تاریخ میں عموماً اور بنگال میں لکھے گئے ناولوں کے زمرے میں خصوصاً، ایک اہم مقام کا دعویدار ہے۔

رانگ نمبر

ناول کی زبان سپاٹ بیانیہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور مکالمے ضرور ہیں لیکن ان جملوں اور مکالموں میں جو گہرائی اور گیرائی ہونی چاہئے، اس کا فقدان ہے۔ البتہ مکھر جی بابو کی زبان سے جو مکالمے ''ادا کرائے گئے ہیں'' وہ بظاہر غیر فطری ہونے کے، دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ناول نگار کو ناول نگاری کے فن سے قطعی واقفیت نہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے کم از کم اردو کے اچھے اور بڑے ناولوں کا مطالعہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

مذکورہ آرا سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہاں لکھے گئے ناول، جن کی تعداد زمانی لحاظ سے بہت کم ہے، ان میں زیادہ تر ناولوں کے موضوعات رومانی اور معاشرتی ہیں اور فنی طور پر کمزور ہیں۔ حیرت اس بات کی ہے کہ یہاں لکھے گئے پہلے مکمل ناول ''احسن'' میں فنی لوازمات کلّی طور پر موجود ہیں۔ اسی بنا پر میں اسے پہلا ناول کہنے پر خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ بیش تر ناولوں کی زبان صاف ستھری، سلیس اور پُرکشش ہے۔ تین ناول تاریخی ہیں جن میں دو جان عالم سیف کے ہیں۔ اُن کے اِن دو تاریخی ناولوں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے عبدالحلیم شرر سے لیکر صادق سردھنوی تک کا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ اس کے علاوہ طالب عشرتی (چاند تارا)، مائل ملیح آبادی (نیا آدمی)، شائق احمد عثمانی (بزم آرا) وغیرہ اہم ہیں۔ ان ناولوں میں ماجرے کا بیان، منظر نگاری، انداز تحریر وغیرہ قابل ستائش ہیں، لیکن ناول کے تمام فنی لوازمات کی کمی نظر آتی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناولوں کو اردو کے عام ناولوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ۲۰۰۳ء میں بنگال کے ایک اہم افسانہ نگار صدیق عالم نے ایک ناول (چارنک کی کشتی) نثری نظم کی ہیئت میں لکھ کر سب کو چونکا دیا۔ میرے خیال میں یہ ناول صرف بنگال کی سطح پر ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر ہندو پاک کی اردو دنیا میں اپنی نوعیت کا منفرد، عمدہ اور کامیاب ناول ہے۔ یہاں دو درجن سے زائد ناول لکھے گئے، ان میں تقریباً سبھی ناولوں کی کہانی کا پس منظر کلکتہ اور اسکے قرب وجوار ہیں، سوائے تاریخی ناولوں کے۔ لیکن چارنک کی کشتی میں کلکتہ کے مکینوں کے ایک مخصوص طبقے کی روح دکھائی دیتی ہے۔

اکثر یہ سوال سر اٹھاتا نظر آتا ہے کہ یہاں لکھے گئے ناولوں کی تعداد کم کیوں ہے تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی اور اہم وجہ تو اس صدی کے وہ سیاسی حالات تھے جن سے بنگال دوچار تھا۔ بنگال کی پہلی تقسیم (۱۹۰۵) سے لیکر دوسری تقسیم (۱۹۴۷) کا ۵۰ رسالہ عرصہ، سیاسی انتشار سے مملو ہے۔ ایک طرف اگر انگریز اپنی حکومت کی بقا کیلئے سرگرداں تھا اور وہ تمام حربے استعمال کر رہا تھا جن کی مدد سے آزادی کی تحریک پر روک لگا سکے، تو دوسری طرف آزادی کے متوالے جان وتن

کی بازی لگا کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لئے کمر بستہ تھے۔ان جیالوں سے اردو دانوں کا ایک بڑا طبقہ، جس میں عوام اور خواص دونوں شامل تھے، بلا واسطہ یا بالواسطہ جڑے تھے۔ البتہ ادیبوں کا مخصوص طبقہ اس سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ جبکہ اس عرصے میں آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ ایک زبردست ادبی تحریک 'ترقی پسند تحریک' کے نام سے چلی جس نے پورے ہندستان اور ہندستان کے ادب کو متاثر کیا۔لیکن نہ جانے کیوں بنگال کا وہ مخصوص طبقہ جس نے اپنے آپ کو اس سے ''محفوظ'' رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔اس طبقے کی قیادت بنگال کے سب سے بڑے شاعر حضرت وحشت کلکتوی کر رہے تھے۔انھوں نے اپنے شاگردوں کو اس تحریک سے دور رکھنے کی تلقین کی۔جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شاعروں میں کچھ اچھے غزل گو ضرور سامنے آئے لیکن دوسری اصناف، خصوصاً نثری صنف سے دوری برقرار رہی۔ایسے میں جو بھی ناول لکھے گئے انہیں غنیمت سمجھنا چاہئے۔

اور پھر آزادی کے بعد (۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک) بنگال کی سیاسی، سماجی اور ادبی فضا (خصوصاً اردو کی) بڑی پُر انتشار تھی۔ بنگال کا ایک حصّہ کٹ کر مشرقی پاکستان بن گیا تھا اور اردو پورے پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے دی گئی تھی۔جس کا برا اثر ہندوستان اور مشرقی پاکستان پر پڑا۔متعصب ذہن رکھنے والے اہل اقتدار نے اردو کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کی مثال شائد ہی کہیں ملے۔اردو اپنے اہم مراکز ہی میں اجنبی بن گئی۔اسکولوں کی چہار دیواری سے اردو کو نکال باہر کیا گیا۔اہل اردو کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آئندہ نسل کو اردو زبان سے نابلد رکھیں۔ایسے میں مدرسوں نے اردو کو زندہ رکھنے میں اہم رول ادا کیا جس کا خمیازہ اسے اب جا کر بھگتنا پڑ رہا ہے۔آئے دن نئی نئی تہمتوں کی تختی اسکی پیشانی پر چسپاں کی جا رہی ہے۔ ویسے مغربی بنگال میں اردو کے ساتھ تو وہ سب کچھ نہیں ہوا، جو اردو کے اہم مراکز میں ہوئے، لیکن یہاں اہل اردو، خصوصاً شعراء نے نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے اپنی زبان کی ادبی بقا کا معیار شعری نشست اور مشاعرے تک ہی محدود رکھا اور نثری ادب پر توجہ خال خال ہی دی گئی۔اسلئے ۱۹۶۰ء سے قبل اتنے ناول نہیں لکھے گئے، جتنے ۶۰ء کے بعد ضبط تحریر میں آئے۔اب تک کی تحقیق کے مطابق دو درجن سے زائد ناول لکھے گئے جن کا تفصیلی مطالعہ گذشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ان ناولوں میں بھی چند ہی ناول ایسے ہیں جو ناول کے فن پر پورے اترتے ہیں، ورنہ زیادہ تر ناولوں میں فنی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ یہ کمزوریاں صرف یہاں لکھے گئے ناولوں کی نہیں ہیں، بلکہ اردو کے اہم مراکز میں بھی جو ناول لکھے جا رہے ہیں وہ بھی اس قسم کی کمزوریوں سے مبّرا نہیں ہیں۔ یہاں بھی اردو کے دوسرے مراکز کی طرح اچھے، بُرے، چھوٹے بڑے ناول لکھے گئے ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ان مراکز کے ناولوں کے مقابلے میں یہاں لکھے جانے والے ناولوں کا معیار اتنا بلند نہیں ہے کہ انہیں صف اوّل کے ناولوں میں شمار کیا جا سکے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کے ہزاروں ناول میں چند ہی ناولوں کو یہ امتیاز حاصل ہے۔وہ بھی اردو زبان کی حد تک، ورنہ دوسری ہندوستانی زبانوں، یا عالمی زبانوں کے ناولوں کے مقابلے وہ بہت پیچھے ہیں۔اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ناول نگار ناول کے پلاٹ کو سوچنے اور فکر کی بھٹّی میں پکانے میں وقت صرف نہیں کرتے، اور نہ ہی لکھنے کے بعد نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ذیل کا اقتباس ملاحظہ کیجئے :

> ''اردو کے ناول نگاروں میں ناول لکھنے کیلئے وہ ریاضت نہیں کی جو دنیا کے عظیم ناول نگاروں نے کی ہے۔فلابیر نے اپنے شاہکار ناول لکھنے کیلئے سالہا سال صرف کئے اور شدید ترین ذہنی مشقت اٹھائی۔فلابیر کی طرح دوسرے عظیم ادیبوں نے اپنے کارناموں کو خوب سے خوب تر بنانے کیلئے جو غیر معمولی محنت و مشقت کی ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے ایف۔ال۔لوکاس نے کیا ہے کہ ان کی محنت حیرت ناک ہوا کرتی تھی۔اس نے بتایا ہے کہ انا طول فرانس اپنے مسودہ کو مسلسل بدلتا رہتا تھا اور جب چھپنے کیلئے دیتا تھا تب بھی آٹھ پروف ہونے تک بھی اپنی تحریر میں تبدیلی کیا کرتا تھا۔ٹالسٹائی نے اپنا بارہ چودہ سو صفحات کا ناول ''جنگ و امن'' سات مرتبہ لکھا تھا۔ جب کہیں وہ مطمئن ہو سکا تھا۔اس کے باوجود بھی ایک لفظ بدلنے کیلئے اس نے اپنے پبلشر کو تار دیا تھا۔اسی طرح جوائس نے ''یولیسس'' لکھنے کے لئے دس سال صرف کئے تھے۔ پروست نے اپنا ناول ''یاد ماضی'' چودہ سال میں مکمل کیا تھا۔اسی طرح اکثر عظیم ناول نگار ایسے رہے ہیں، جنھوں نے غیر معمولی محنت و ریاضت کی۔لیکن اس کے برخلاف اردو میں اپنے ناولوں کو دوبارہ لکھنے والے بھی کم ہی ملتے ہیں بلکہ ہمارے اکثر بڑے اور اہم ناول نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے کارناموں پر نظر ثانی بھی نہیں کی ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول/ڈاکٹر یوسف سرمست ص ۵۱۹-۵۲۰)

محولہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ کسی عظیم فن پارے کی تخلیق کے پیچھے کتنی سخت ذہنی محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فن کار کو، خصوصاً ناول نگار کو، اچھے اور بڑے ناولوں کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ جس کا فقدان یہاں کے بیشتر ناول نگاروں کے یہاں خصوصی طور پر نظر آتا ہے، جو خوش آئند بات نہیں ہے۔

مصنف کا اجمالی تعارف

نام	: یوسف رئیس تقی
قلمی	: یوسف تقی
والد کا نام	: محمد رئیس الدین (مرحوم)
تاریخ پیدائش	: ۱۵/اگست ۱۹۴۳
تعلیم	: ایم اے، پی ایچ ڈی
پیشہ	: پروفیسر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی
پتا	: ۱۹بی، مارکوئیس لین، کولکاتا-۱۶
فون	: ۲۲۵۲-۷۵۹۰

A brief introduction of the author

Name	: **YOUSUF RAIS TAQI**
Pen Name	: YOUSUF TAQI
Father's Name	: Late Md. Raisuddin
Date of Birth	: 15th August, 1943
Qualification	: M.A., Ph.D.
Profession	: Teaching (Professor, Dept. of Urdu, Calcutta University)
Address	: 19-B, Marquis Lane, Kolkata - 700 016
Phone	: 2252-7590

دیگر تصانیف

ترقی پسند تحریک اور اردو نظم (تحقیق وتنقید)
مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعرا (تحقیق وتدوین)
مثنوی جہاں شاہ جہاں بانو (تحقیق وتدوین)
تمحیص وتجزیہ (تحقیقی وتنقیدی مضامین)
خشک ٹہنی زرد پتے (شعری مجموعہ)
بدرالزماں بدر کلکتوی حیات وخدمات (تحقیق وتنقید)

منتظر اشاعت

اردو نظم اور نظم گو شعرا (تذکرہ وتنقید)
مطالعۂ غزلیاتِ طپش (تحقیق وتنقید)
ل-احمد-اکبرآبادی : ایک جائزہ (تحقیق وتنقید)

یہ کتاب اپنے احباب کو میل کیجئے

اردو دوست لائبریری

اردو دوست ڈاٹ کوم

www.urdudost.com/library